

اسرارِ قلب

خلیل جبران

مدیر:

ذہن نشین

مترجم:

عبدالحمید یوسف

ایک نذرانہ عقیدت بیکس عوام کے نام

Everyyoung Global Intellectual Foundation



اسرارِ قلب

خلیل جبران

مترجم:

عبدالحمید یوسف

مدیر:

ذہن نشین

ایک نذرانہء عقیدت بیکس عوام کے نام

Everyoung Global Intellectual Foundation



© جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ ذاتی مطالعہ، تحقیق، تنقید یا جائزہ لینے کے مقاصد کی رو سے کسی بھی منصفانہ استعمال کے علاوہ، کسی بھی تجارتی مقصد کے لئے اس اشاعت کا کوئی حصہ حق اشاعت کے مالک کی پیشگی اجازت کے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جملہ حقوق بحق ایورینگ گلوبل انٹیلیکچوئل فاؤنڈیشن،
کاتھمنڈو، نیپال محفوظ ہیں۔

بار اول: 2016 عیسوی

ISBN: 978-99946-898-5-9
Everyong Global Intellectual Foundation
Ward 11, Gokarneshwor Municipality,
Kathmandu, NEPAL
Website: www.eygif.org
Contribution: NRs: 1000/= or USD 10.00

عالم ادب کا

ایک شہکار

پیش لفظ

انسانی سکونت و رہن سہن اور ماحول کے ہر شعبے میں بے رحمانہ تنازعات کی دنیا، از حد بد قسمتی سے، ہمارا عالم ہے۔ اس صورتِ حال کی سب سے بڑی مثال فوجوں، پولیس، عدالتوں، جیلوں اور ان سب کے متعلق بنیادی ڈھانچے، مثلاً ہتھیار، وغیرہ کی ہے، جو دنیا کی پیداوار کا ایک تہائی سے نصف حصہ ختم کر جاتے ہیں؛ اور جو باقی پر نہ صرف تسلط جمائے بیٹھے ہیں، بلکہ اسے نیست و نابود کرنے کے شدید خوف کا سرچشمہ بھی ہیں۔

ہم جنگ کے ایک نظام کے چنگل میں جکڑے ہوئے ہیں، جس سے ہمارا کوئی بچاؤ نہیں ہے۔

جس طرح سے ہم سے ہو سکے، ہمیں اس لڑائی میں لڑنا ہی ہو گا؛ اور موجودہ دنیا کے ان تباہ کن حالات کے خلاف لڑنے کے لئے ہم نے اپنی پوری کوشش کرنے کا انتخاب کیا ہے۔

ہمارا ہتھیار ادب ہے۔ اور ہماری یلغار کا آغاز ان تصانیف سے ہو رہا ہے۔ جن کا سپہ سالار خلیل جبران ہے۔

خلیل جبران (1883 تا 1931 عیسوی) دنیا کے کروڑوں لوگوں کا محبوب مصنف بنا، اور ہے؛ اور یہ بلاوجہ نہیں ہے۔

خلیل جبران کی تصانیف کے بہتر ادراک اور لطف اندوزی کے لئے انسانی فلسفے کے ارتقاء کی تاریخ کا تھوڑا سا جائزہ لینا ضروری ہے۔

تسخیر یا دوبارہ پیدا ہونے کا خیال یا نظریہ، قدیم ہے؛ اور یہ شاید فطرت کے عام مشاہدے سے حاصل کیا گیا ہے: دن کے بعد رات کا آنا، اور رات کے بعد دن کا؛ سورج کا غائب ہو جانا اور دوبارہ نمودار ہونا؛ موسموں کی دائری فطرت؛ درختوں اور پودوں پر برگ و بار نمودار ہونا اور موسم خزاں میں ان کا اتر جانا۔

مہاتما بدھ نے اپنی وفات کے وقت ناپذیر تسکین اپنے شاگرد، آئند، کو تسکین دلائی تھی، ”نہیں آئند، روتے نہیں۔ کیا میں نے یہ پہلے ہی تم سے نہیں کہا ہے کہ ہمارے عزیز و اقربا سے ہماری جدائی ناگزیر ہے؟ جو کچھ بھی پیدا ہو جاتا ہے، جو کچھ بھی وجود میں آتا ہے، یا جس کی نشو و نما کی جاتی ہے، خود اس کے باطن ہی اس کی تباہی کی فطرت چھپی ہوتی ہے۔ اس کی کوئی دوسری صورت حال ہو ہی نہیں سکتی ہے۔“

یونانی فلسفی اناکساگورس (500 تا 428 ق م) نے اعلان کیا، ”طبیعیاتی دنیا میں، ہر ایک چیز میں ہر دوسری شے کے جزو شامل ہیں۔“ مثال کے طور پر، ”کوئی مویشی جو غذا کھاتا ہے، وہ اس کی ہڈی، بال، گوشت وغیرہ میں تبدیل ہوتا ہے؛ اس لئے لازماً اس میں پہلے ہی وہ تمام عنصر ہونے چاہئیں۔“ یہاں یہ بات کہنا بھی مناسب ہو گی کہ ایتھنز کی عدالت نے اناکساگورس کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ سنایا، کیونکہ اس نے ”سورج ایک شعلہ فشاں چٹان ہے“ کہا تھا، جو مذہب کے نظریہ کے خلاف تھا۔ تاہم اناکساگورس نے ایتھنز کو ہمیشہ

کے لئے چھوڑ کر خود کو بچا لیا۔

حقیقت یا غیر حقیقت کا نظریہ ترقی کے کئی مراحل سے گزرا اور مختلف واقعات کے بعد کئی معیارات تک پہنچا۔ اس ضمن میں یہاں ایک متعلقہ معیار قابل ذکر ہے جو شکر اچاریہ میں دکھائی دیتا ہے، جس (شکر اچاریہ) نے ہر کسی شے کو ایک سراب (مایا) مانا؛ وہ اس وجہ سے کیونکہ کوئی بھی چیز دائمی نہیں ہے۔ اور تصوف (صوفی مت) اور آگے بڑھا اور اس نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے ساتھ ساتھ قدیم عربی تصورات برزخ (وہ مقام جہاں، بقول ان کے، ارواح زمین پر اترنے سے پہلے رہائش کرتے ہیں)، اعراف (زمین سے گزر جانے کے بعد ارواح کی رہائش گاہ) کے ساتھ ساتھ ثابتہ، اعیان و جوہ (تصوف کے انداز فکر میں تین روحانی مراحل) اور دیگر کئی سارے تصورات کو آگے بڑھایا۔

غور و فکر کی یہ ندی اب تک کی اپنی آخری منزل پر ہیگیل کی جدلیات میں پہنچی (یعنی تغیر پزیر حقیقت—حقیقت یا غیر حقیقت کے تصورات پر بحث کی بجائے)، جس کا مظاہرہ ادب میں خلیل جبران کی تصانیف ہیں۔ جدلیات کے چار بنیادی اصولوں کا (جہاں تک میں نے انہیں سمجھا ہے) یہاں ذکر کرنا ضروری ہے۔

1) چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر مکمل کائنات تک، ہر موجود شے کے حدود ہیں۔ دن، موسم، وقفہ زندگی، زمانہ ہا، زمین، نظام شمسی، کہکشاں، مرنی و غیر مرنی کائنات ... ہر کسی شے کے مادی اور وقتی حدود ہیں۔

(2) با حدود شے لا محدود سے بنی ہے اور لا محدود با حدود سے۔ مثال کے طور پر، اعداد کی لکیر کے کسی بھی حلقے میں لا محدود نقاط ہوتے ہیں؛ اور صحرائے صحارا اور دنیا کے تمام صحراؤں کی ریت کے ذرے گنے جا سکتے ہیں۔ یہاں پر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ لا محدود محض ایک لا محدود نہیں، لا محدود لا محدود ہیں۔ مثلاً ایک سے دو تک جو لا محدود نقاط ہیں، اور تین سے چار تک جو لا محدود نقاط ہیں، وہ الگ الگ ہیں۔

(3) تمام چیزیں (خوشی، درد، دوستی، دشمنی، زندگی، کام، شراکت، انسانی تعلقات ...) بامعنی ہیں، مگر محض اپنی سرحدوں اور حدود میں؛ ان سرحدوں کے باہر سب کچھ اپنی مطابقت اور معنی کھو دیتا ہے۔ یہ حدود جسمانی ہو سکتے ہیں (اگر آپ نیویارک یا کراچی میں رہتے ہیں تو آپ اپنے گھر میں شیر کے آنے کی اور آپ کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کی توقع نہیں کر سکتے ہیں) یا وقتی ہو سکتے ہیں (آپ موسم گرما کے مہینوں میں موسم سرما کی ٹھنڈ محسوس کرنے کی توقع نہیں کر سکتے ہیں)۔

(4) کسی بھی چیز کی ایک سمت میں ہو رہی مسلسل پیش قدمی ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنے متضاد میں تبدیل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، دن رات میں اور رات دن میں تبدیل ہوتے ہیں۔ رقابت اجارہ داری کی طرف اور اجارہ داری رقابت کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ ”جمہوریت“ ”آمریت“ میں اور ”آمری“ ”ت“ ”جمہوریت“ میں تبدیل ہوتی ہے۔ بہار موسم خزاں میں بدل جاتا ہے تو اس کا برعکس بھی ہوتا ہے

جدلیات کے مابقی اصول اور تین قوانین اس پیش لفظ کے دائرہ کار سے الگ ہیں۔

تسخیر یا دوبارہ پیدا ہونے کا خیال یا نظریہ، پیدا شدہ ہر شے کی تنظیم و تباہی، ہر کسی چیز میں ہر دوسری شے کے جزو شامل ہونے کا نظریہ، سراب (مایا)، تصوف (صوفی مت) کے تصورات اور حسبِ بالا دیئے گئے جدلیات کے اصولوں کے بارے میں اس ابتدائی ادراک کے ساتھ، آپ اب خلیل جبران کی عظیم دانش سے اپنی رفاقت کا بھرپور لطف اٹھا سکتے/سکتی ہیں۔

خلیل جبران کی مصوری کو ان، متون پر مبنی، تصانیف میں ہم نے شامل نہیں کیا، وہ محض اس لئے کہ بھارت، پاکستان اور نیپال میں کلچر کی سطح ابھی ”شرمندگی آمیز“ ہے، گرچہ لوگ ہسپتالوں میں جاتے ہیں، نسوانی امراض کے شعبہ میں اپنا معائنہ کرواتے ہیں، جراحی کرواتے ہیں، اور پورے کپڑے اتار کر اپنے اجسام ماہرِ جراحی، ان کے شرکہ اور دیگر افراد کے سپرد کرتے ہیں، اور گرچہ مہاویر جین، لیبیٹوری اور دوسرے لوگوں کی ایک وسیع رینج نے کوئی کپڑے نہیں پہنے، اور لوگوں نے انہیں اعلیٰ ترین احترام سے بھی نوازا۔

قارئین میں سے کسی کو بھی اس ”شرمندگی“ سے بچانے کے لئے، ہم نے ان تصانیف میں مصوری شامل نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو قارئین اس مصوری کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ <http://www.inner-growth.info/khalil>

پر gibran_prophet/html/galleries/gibran_gallery1.htm

جا سکتے ہیں۔

مزید کسی تاخیر کے بغیر، آئیے اپنا سفر شروع کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان تصانیف سے آپ لطف اندوز ہوں گے اور یہ آپ کے مفاد کی آبیاری کریں گی۔

ذہن نشین

مارچ 4، 2016 عیسوی



خليل جبران

(1883 تا 1931 عيسوی)

فہرست مضامین

i	پیش لفظ
1	اسرارِ قلب
8	میرے ہم وطنو!
18	جان وہ دیوانہ
42	فسونِ کارِ حور
49	پسِ پردہ
54	مر گئے میرے لوگ
65	حوصلہ مند گلِ بنفشی
72	مصلوب
79	جشن کی شام
86	گور کن
92	شہد ملایا زہر

اسرارِ قلب

ایک سنسان رات کے پنکھوں تلے ایک عظیم الشان حویلی کچھ اس طرح کھڑی تھی جیسے موت کے سائے میں زندگی رہتی ہے۔ اس حویلی میں عاج سے بنے ڈھلوان میز کے سامنے ایک حسینہ، اپنے خوبصورت سر کو اپنے نرم و نازک بازوؤں پر رکھے ہوئے، کچھ اس طرح بیٹھی تھی، جیسے کوئی مرجھا رہا سوسن اپنی پنکھڑیوں پر اپنے سر کو راحت دے رہا ہو۔ حسینہ نے چار سو اپنی نگاہ دوڑائی۔ وہ خود کو ایک بد حال قیدی جیسا محسوس کر رہی تھی جو آزادی کے بھوم میں گامزن زندگی کا دیدار کرنے کی تمنا میں اپنی نظروں سے قید خانے کی دیواروں کو چیرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

مانو کوئی بھوم اس کے رنج و غم کی نوحہ خوانی کر رہا ہو، گھڑیاں ویسے

ہی رات کے بھوتوں کی مانند گزرتی گئیں، اور اپنی عذاب یاب تنہائی میں گریہ پیہم میں اسے اپنے پناہ کا احساس ہوا۔ جب اسے اپنے درد و عذاب کا بوجھ سہنے کی مزید سکت نہ رہی، اور چنانچہ اسے لگا کہ اسرارِ قلب کا بھر پور خزانہ اس کے پاس ہے، تو اس نے پنکھ کا قلم اٹھا کر چرمی کاغذ پر اپنے آنسوؤں کو روشنائی سے ملانا شروع کیا؛ اور تحریر کیا:

”میری پیاری بہن،

”جب دل راز ہا کا مجمع بن جائے، نگاہیں سوزِ گریاں سے بے محابا جلنے لگیں، اور دل کی اسیری کے سخت ہوتے ہوئے عذاب سے پسلیاں پھٹنے لگیں، تو ایسی ہولناک الجھنوں کے مقام سے کوئی انسان راحت پا نہیں سکتا اگر رہائی کی تموج اسے مل نہ جائے۔

”غم زدہ اشخاص ماتم کر کے فرحت پاتے ہیں، عاشق و معشوق کو خوابوں میں راحت و ہمدردی ملتی ہے اور مظلوم کو عنخواری حاصل ہونے سے خوشی ملتی ہے۔ فی الوقت میں تمہیں اس وجہ سے لکھ رہی ہوں کہ میری حالت خداداد طاقت کے زیرِ حکومت اشعار میں ان چیزوں کے تاثرات اظہار کرنے والے شاعر کی سی ہے جو مناظر کی خوبصورتی پر فریفتہ ہوتا ہے... میں ایک فاقہ زدہ مفلس کے بچے کی مانند ہوں جو بھوک کی تلخی سے ستایا ہوا ہونے کے سبب اپنی بے بس اور رحیم ماں کی حالتِ زار اور زندگی میں اس کی شکست کو نظر انداز کر کے کھانے کے لیے آہ و بکا بلند کرتا ہے۔

”میری پیاری بہنا، میری درد ناک کہانی سنو، اور تم بھی میرے ساتھ آسو بہاؤ، کیونکہ گریہ زاری دعا جیسی ہے، اور رحم کے آنسو سخاوت جیسے ہیں کیونکہ یہ ایک زندہ، حساس اور عمدہ روح سے نمودار ہوتے ہیں؛ اور یہ بیکار میں نہیں بہتے ہیں۔ ایک اعلیٰ و مالدار شخص سے میں نے شادی کی کیونکہ

یہ میرے والد کا عزم تھا۔ میرے والد ویسے ہی تھے جیسے کہ اکثر رئیس ہوا کرتے ہیں، جن کی زندگی کی محض ایک مسرت، غریب ہو جانے کے ڈر سے، اپنی تجزیوں میں مزید سونا بھر کر اپنے مال و زر میں اضافہ کرنا ہے۔ اور برے دنوں کے حملوں کی توقع میں امیرانہ ٹھاٹھ کے ساتھ اپنی رئیس کو رو بہ عمل رکھنا ہے... اپنی مکمل محبت اور خوابوں سمیت میں آج اپنے کو ایک طلائق قربان گاہ پر نیاز کی گئی چیز جیسی لگ رہی ہوں۔ اس قربان گاہ سے مجھے نفرت ہے۔ اور اپنے آپ کو میں ایک موروثی وقار سا محسوس کرتی ہوں جسے مجھے گھن ہے۔

"میں اپنے شوہر کی عزت کرتی ہوں، کیونکہ وہ ہر ایک کے لیے سخی اور رحمدل ہیں، وہ مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور میرے دل کی خوشی کی خاطر اپنا سونا خرچ کرتے ہیں، لیکن ان ساری چیزوں کا اثر حقیقی اور روحانی محبت کے ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہے۔ میری بہن، میرا مذاق مت اڑا، کیونکہ اب مجھ پر ایک عورت کے دل کی ضروریات سب سے زیادہ عیاں ہو چکی ہیں۔ ایک دھڑکتا ہوا دل جو محبت کے کھلے آسمان میں ایک اڑتے ہوئے پرندے کی مانند ہے... یہ ایک صراحی کی طرح ہے جو میکش روحوں کے لئے زمانہ ہا سے نچوڑی گئی شرابوں سے بھرا ہوا ہے... یہ ایک کتاب جیسی ہے جس کے صفحات میں کوئی خوشی اور نعم، مسرت اور درد اور ہنسی اور

دکھ کے ابواب پڑھ سکتا ہے۔ اس کتاب کو ما سوائے اس حقیقی ساتھی کے کوئی اور نہیں پڑھ سکتا ہے جو عورت کا نصف ہے، عالم کے روزِ ازل سے ہی جس کی پیدائش عورت کے لئے ہوئی ہے۔

"ہاں، روح کا مقصد اور دل کا مطلب جاننے کے حوالے سے میں تمام خواتین میں سب سے بڑی جانکار بن گئی ہوں کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ شاندار گھوڑوں، خوبصورت محمولوں، طلائی کی بھر پور چھماتی تجوریاں اور پُر جلال رُئیسی کی قدر اس غریب نوجوان کی ایک نگاہ کے آگے ہیج ہیں، جو با صبر انتظار کر رہا ہے اور تلخی اور تکلیف کی ٹیسیں برداشت کر رہا ہے.... وہ جوان جو میرے والد صاحب کے ظلم اور ارادے کا جفا خوردہ ہے اور زندگی کی تنگ اور افسردہ زنداں میں محبوس ہے...."

"خدا را، میری پیاری، مجھے تسلی دینے کی کوئی سبیل کے بارے میں مت سوچو، کیونکہ وہ آفت جس کے ذریعہ میں نے اپنی محبت کی طاقت ذہن نشین کی ہے وہی میری سب سے بڑا تسلی دان ہے۔ اب میں اپنے اشکوں کے دریچے سے آگے جھانک رہی ہوں اور موت کی آمد کا انتظار کر رہی ہوں کہ وہ مجھے میری روح کے ساتھی سے ملاقات کرانے اور اسے گلے لگانے کی منزل تک لے جائے، جیسے میں اس عجیب عالم میں آمد سے قبل کیا کرتی تھی۔"

"میرے بارے میں برا مت سوچ، کیونکہ میں ایک وفادار بیوی کا اپنا

فریضہ انجام دے رہی ہوں اور صبر و سکون کے ساتھ مرد حضرات کے بنائے ہوئے قوانین اور اصولوں پر عمل کر رہی ہوں۔ میرے شعور سے میں اپنے شوہر کی عزت کرتی ہوں، میں دل سے ان کی تعظیم کرتی ہوں اور میں روح سے ان کا احترام کرتی ہوں، لیکن پھر بھی ایک تامل طاری ہے، کیونکہ اس شوہر سے پہچان ہونے سے پہلے ہی خدا نے میرا ایک جز میرے محبوب کو دے دیا۔

"عالم بالا کا منشا ہوا کہ میں اپنی زندگی اس شخص کے ساتھ گزاروں جو میرے لئے نہیں بنا تھا اور اس خواہش کے مطابق میں اپنے ایام کو خاموشی سے ضائع کر رہی ہوں؛ لیکن اگر ابدیت کا پھانک وا نہ ہوا، تو میں اپنی روح کے خوبصورت نصف کے ساتھ رہوں گی اور ماضی کو تکتی رہوں گی، اور وہ ماضی یہی وقتِ حال ہے... میں زندگی کو اس نظر سے دیکھوں گی جیسے موسم بہار سرما کے موسم کو دیکھتی ہے، اور میں زندگی کی رکاوٹوں پر اس شخص کی مانند غور و فکر کروں گی جو دشوار گزار چڑھائی چڑھ کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا ہے۔"

اُس لمحے اس حسینہ نے لکھنا بند کر دیا اور اپنے رخسار کو پیالہ نما ہاتھوں میں چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کے دل نے اس کے متبرک ترین راز ہا قلم کو سوچنے سے انکار کیا، مگر خشک آنسوؤں کی ایک طغیانی میں سہارا لیا،

جو جلدی ہی منتشر ہوئے اور نرم و نازک خلائی شے سے ملے، جو عاشقوں کی
 روحوں اور پھولوں کی باطن کی پناہ گاہ ہے۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے پنکھ کا
 قلم اٹھایا اور لکھا:

"کیا تمہیں وہ نوجوان یاد ہے؟ کیا تم اس کی آنکھوں سے نمودار ہونے والی
 وہ کرنیں اور اس کے چہرے پر غم زدگی کی نشانیاں پھر سے یاد کر سکتی ہو؟ کیا
 تم اس ہنسی کا از سر نو خیال کر سکتی ہو جو ایک ماں کے آنسو بیان کرتی تھی
 جس ماں کا اکلوتا بچہ اس سے زبردستی الگ کیا گیا ہو؟ کیا تم اس کی پرسکون
 آواز کا تصور کر سکتی ہو جس میں کسی دور کی وادی کی گونج سنائی دیتی تھی؟
 اس کا مراقبہ میں جانا اور شے ہا کو بہ اشتیاق اور باطمینان تکانا، پھر ان کے
 بارے میں عجیب الفاظ میں باتیں کرنا اور اس کے بعد اپنے سر کو جھکا کر اس
 طرح آہیں بھرنا، گویا کہ وہ اپنے عظیم دل کے راز ہا افشا کرنے سے ڈرتا ہو،
 کیا تمہیں یہ سب باتیں یاد ہیں؟ کیا تم اس کے خوابوں اور اعتقادات کو یاد کر
 سکتی ہو؟ کیا تم ذہن میں لا سکتی ہو کہ ایک نوجوان میں یہ ساری چیزیں
 موجود تھیں، اور جسے انسانیت اپنے ایک فرزند کی حیثیت میں شمار کرتی تھی
 لیکن جسے میرے والد صاحب برتری کی نظروں سے دیکھتے ہوئے حقیر سمجھتے
 تھے کیونکہ وہ دنیاوی حرص سے بالاتر اور موروثی آن بان سے اعلیٰ تھا؟

"میری پیاری بہن، تمہیں معلوم ہے کہ لوگوں کو نیچا دکھانے والی اس دنیا

میں میں ایک شہید ہوں اور میں جہالت کی ستم رسیدہ ہوں۔ کیا تم اپنی بہن سے ہمدردی کرو گی جو اس وحشت ناک رات کی خاموشی میں بیٹھی اپنی اندرون ذات کی شے ہانڈیل رہی ہے اور تم پر اپنے اسرارِ قلب عیاں کر رہی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہو گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ محبت تمہارے دل میں داخل ہو چکی ہے۔“

صبح ہوئی، اور حسینہ نے اس امید کے ساتھ نیند کا غلبہ تسلیم کیا کہ اسے حالتِ بیداری میں پیش آئے خوابوں سے شیریں اور رحیم خواب دیکھنے کو ملیں گے۔

میرے ہم وطنو!

تم چاہتے کیا ہو؟ میرے ہم وطنو!
کیا تمہاری یہ تمنا ہے کہ میں تمہارے لیے
مفہوم سے عاری الفاظ سے آراستہ پیراستہ
عظیم الشان محل تعمیر کروں
یا خوابوں کی بام لگائی ہوئی
عبادت گاہیں تعمیر کروں؟
یا پھر تم مجھے اختیار دیتے ہو کہ میں
وہ سب کچھ مسمار کروں
جو دروغوں اور ظالموں نے تعمیر کیا ہے؟
کیا میں اپنی انگلیوں سے وہ سب اکھاڑ دوں
جو مکاروں اور خبیث خواتین و حضرات نے لگایا ہے؟
اپنی سودائی تمنا ظاہر کرو، میرے ہم وطنو؟

تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، میرے ہم وطنو؟
تمہیں تسلی دینے کے لئے کیا میں

بلی کے بچے کی مانند میاؤں میاؤں کروں،
یا اپنی خوشی کی خاطر شیر کے طرح دھاڑوں؟
میں نے تمہارے لیے گیت گائے،
مگر تم نے رقص کیا نہیں؛
میں تمہارے سامنے رویا،
پر تم نہیں روئے۔
کیا میں بیک وقت نغمہ سرائی اور اشکباری بھی کروں؟

تمہاری روحیں بھوک کی ٹیسیں سہہ رہی ہیں،
مگر یہ تب بھی برپا ہو رہا ہے، جب کہ
علم کے میوہ جات وادیوں میں پتھروں سے
کثیر التعداد ہیں۔

تمہارے قلب تشنگی سے پژمردہ ہیں،
مگر یہ تب بھی برپا ہو رہا ہے، جب
زندگی کے چشمے تمہارے گھروں کے ارد گرد
بہہ رہے ہیں:

تم پیٹے کیوں نہیں ہو؟

بحر کا اپنا جوار بھاتا ہے،

چاند کا اپنا دورِ ہلال تو کبھی دورِ بدرِ کامل ہوتا ہے،

اور زمانہ ہا کے اپنے اپنے گرمی اور سردی کے موسم ہوتے ہیں،

اور زمین اور سورج کے بیچ چلنے والے ناپید خدا کے سایے کی مانند

تمام چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں،

لیکن حقیقت کو بدلا نہیں جاسکتا، نہ یہ فنا ہوتی ہے؛

پھر تم اس کے چہرے کو کیوں کر مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

چاند کی شان و شوکت اور ستاروں کے وقار سے روشناس کرانے کی خاطر

میں نے رات کی خاموشی میں تمہیں پکارا؛ لیکن تم

اپنی نیند میں چونک گئے اور دہشت زدہ ہو کے

اپنی اپنی تلوار پکڑ کر چیخنے لگے،

”کہاں ہے دشمن؟ ہمیں پہلے اس کو مارنا چاہئے۔“

وقتِ سحر، جب دشمن آگئے تو میں نے تمہیں دوبارہ پکارا،

لیکن تم نیند سے بیدار نہ ہوئے۔ کیونکہ تم خوف میں جکڑے ہوئے تھے

اور اپنے خوابوں میں بھوتوں کے ہجوم سے کشتی کھیل رہے تھے۔

اور ایک مرتبہ میں نے تم سے کہا،
"چلو، پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے ہیں، اور وہاں سے
دنیا کی خوبصورتی کا نظارہ کرتے ہیں۔"
تو تم نے جواباً فرمایا، "اس وادی کی گہرائیوں میں
ہمارے آباء و اجداد رہا کرتے تھے، اسی وادی کے سائے میں وہ انتقال کر
گئے

اور اسی کے غاروں میں انھیں دفن کیا گیا۔ آخر ہم اس مقام کو چھوڑ
کسی ایسے مقام کو کیسے جا سکتے ہیں جسے
ہمارے آباء و اجداد نے شرف نہ بخشا؟"

میں نے تم سے کہا، "تو پھر میدان میں چلتے ہیں
جو اپنی نعمتیں سمندر کو عطا کر دیتا ہے۔"
تم نے بزدلی سے مجھے یہ جواب دیا،
"بے پایاں کا آشوب ہماری روحوں کو خوفزدہ کرے گا
اور گہرائی کی دہشت ہمارے جسموں کو شل کرے گی۔"

میں نے تمہیں محبت کی ہے، میرے ہم وطنو!
 مگر تمہارے لیے میری محبت مجھے تکلیف دہ بن گئی
 اور وہ تمہارے لئے فضول کی چیز ثابت ہوئی؛
 اور آج میں تم سے نفرت کرتا ہوں، اور نفرت
 ایک طغیانی ہے جو سوکھی شاخوں اور لرزتے ہوئے مکانوں کو دور بہا لے
 جاتی ہے۔

میں نے تمہاری کمزوری پر ترس کھایا ہے، میرے ہم وطنو!
 لیکن میرے اس جذبہٴ رحم نے محض تمہاری کمزوری میں اضافہ کیا
 اور اس کاہلی کو مشرف کیا اور اس کی پرورش کی
 جو زندگی کے لیے بے کار ہے۔ اور آج میں تمہاری ناتوانی دیکھتا ہوں
 جس سے میری روح از حد متنفر اور خوفزدہ ہے۔

میں نے تمہاری ذلت اور فرمانبرداری پر گریہ زاری کی ہے؛
 اور میرے اشک بلوریں جیسے بہہ نکلے، لیکن وہ تمہاری ساکت کمزوری
 پر ضرب لگا نہ سکے؛ تاہم انھوں نے پردہ ہٹا دیا میری آنکھوں سے۔

میرے آنسو تمہارے دہشت زدہ دلوں تک کبھی پہنچ نہ سکے، تاہم
 انھوں نے میرے باطن سے تاریکی دور کی۔
 آج میں تمہاری مصیبتوں کا مذاق اڑا رہا ہوں،
 کیونکہ ہنسی ایک غضبناک گرج ہے جو
 طوفان سے قبل رونما ہوتی ہے
 اور طوفان گزر جانے کے بعد کبھی نہیں آتی۔
 میرے ہم وطنو! تمہاری تمنا کیا ہے؟
 کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری صورت کا بھوت ٹھہرے ہوئے پانی پر
 دکھا دوں؟

آؤ، ابھی آؤ، اور دیکھو : تم کتنے بد صورت ہو!
 دیکھو اور غور و فکر کرو! خوف نے تمہارے بال راکھ کی طرح
 سرمئی کر دیے ہیں، تباہی تمہاری آنکھوں پہ چھا چکی ہے
 اور انہیں دھندلے سوراخ بنا دیا ہے، اور بزدلی نے
 تمہارے رخسار چھو لیے ہیں اور اب
 وہ کسی وادی کے افسردہ گڑھوں جیسے لگ رہے ہیں، اور موت نے تمہارے
 ہونٹ چومے ہیں اور انہیں

خزاں کی پتوں کے مثل زرد کر کے چھوڑا ہے۔

میرے ہم وطنو! تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟

تم زندگی سے کیا مانگتے ہو،

جب کہ زندگی تمہیں اب مزید اپنی اولاد میں شمار نہیں کرتی؟

تمہاری روحیں ملاؤں اور مداریوں کے شکنجوں میں منجمد ہو رہی ہیں

اور جابر وں اور خون بہانے والوں کے بیچوں کے درمیان

تمہارے بدن کانپ رہے ہیں، اور تمہارا ملک

فاتح دشمن کے بڑھتے قدموں تلے تھر تھرا رہا ہے؛

تم کس چیز کی توقع کر سکتے ہو؛ چاہے تم سورج کے چہرے کے سامنے

با فخر بھی کھڑے کیوں نہ ہوں؟

تمہاری تلواروں پر زنگ کی نیام چڑھ گئی ہے، اور تمہارے بھالے ٹوٹ

چکے ہیں

اور تمہاری ڈھالوں میں شگاف پڑ گئے ہیں؛

پھر تم جنگ کے میدان میں کیوں کھڑے ہو؟

منافقت تمہارا مذہب ہے، جھوٹ تمہاری زندگی ہے

اور عدم تمہارا انجام۔ پھر تم زندہ کیوں کر ہو؟
 کیا بد حال کے لئے موت ہی واحد سامانِ تسلی نہیں ہے؟
 زندگی ایک عزم ہے جو جوانی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے؛
 زندگی ایک محنت ہے جو بلوغت کا تعاقب کرتی ہے، اور
 ایک دانشمندی ہے زندگی، جو بڑھاپے کی ضعیفی
 کی ہمراہ ہوتی ہے؛ لیکن میرے ہم وطنو! تم پیدا ہی
 سن رسیدہ اور کمزور ہوئے تھے۔ اور تمہاری کھالیں مرجھا گئیں
 اور تمہارے سر سکڑ گئے،
 جس کی وجہ سے
 تم بچے جیسے بن گئے،
 جو دلدل میں دوڑتے
 اور ایک دوسرے پر سنگ باری کرتے ہیں۔

علم ایک روشنی ہے جو زندگی کی گرم جوشی
 میں اضافہ کرتی ہے،
 اور جو کوئی بھی اسے پانے کی سعی کرتا ہے
 اسے اس کے فیض کا شرف حاصل ہوتا ہے؛

لیکن تم، میرے ہم وطنو، تم ظلمت کے متلاشی ہو، اور
 تم روشنی سے بدکتے ہو، تمہیں تو چٹان سے
 پانی نکلنے کا انتظار ہے، اور تمہارے وطن کی بد حالی
 تمہارا ہی جرم ہے.... میں تمہارے گناہوں کے لئے
 تمہیں معاف نہیں کر سکتا، کیونکہ تم جانتے ہو
 کہ تم کیا کر رہے ہو۔

انسانیت ایک روشن دریا ہے
 جو نغمہ طراز، اپنی راہ پر گامزن،
 پہاڑوں کے راز اپنے ساتھ
 سمندر کے دل میں لے کر جاتا ہے؛ لیکن تم،
 میرے ہم وطنو! تم ٹھہرے ہوئے دلدل ہو
 جو کیڑے مکوڑوں اور زہریلے سانپوں سے بھرا ہے۔

روح ایک مقدس نیلی قندیل ہے
 جو سوکھے پودوں کو جلا کر کھا جاتی ہے،
 جو طوفان کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے

اور دیویوں کے چہروں کو منور کرتی جاتی ہے؛
 لیکن تم، میرے ہم وطنو!...
 تمہاری روحیں راکھ جیسی ہیں جنہیں
 ہوائیں برف پر بکھیر دیتی ہیں
 اور جن کو طوفان وادیوں میں ہمیشہ کے لئے بکھیر دیتا ہیں۔

ملک الموت سے مت ڈرو،
 میرے ہم وطنو! کیونکہ اس کی عظمت
 اور رحمدلی تمہارے چھوٹے پن کے قریب
 آنا قبول نہیں کرے گی؛ اور خنجر سے دہشت زدہ مت ہو
 کیونکہ یہ تمہارے کم ظرف دلوں میں پیوستہ ہونے سے انکار کرے گا۔

میں تم سے نفرت کرتا ہوں، میرے ہم وطنو!
 کیونکہ تمہیں کامرانی اور عظمت سے نفرت ہے۔
 میں تم سے گھن کھاتا ہوں کیونکہ تم اپنے آپ سے گھن کرتے ہو۔
 میں تمہارا دشمن ہوں کیونکہ تم یہ نہیں سمجھتے ہو کہ تم دیویوں کے دشمن

ہو۔

جان، وہ دیوانہ

کندھے پر ہل رکھے اور اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے، جان گرمی کے موسم میں روزانہ صبح کے وقت، پرندوں کی تسلی بخش چچہاہٹ اور پتیوں اور گھاس کی سرسراہٹ سنتے ہوئے، کھیت کی جانب خراماں خراماں چل پڑتا۔ دوپہر کے وقت جب وہ رنگ برنگے گھاس کے میدان میں ایک آبجو کے کنارے پر بیٹھ کر کھانا کھاتا تو ہری بھری گھاس پر آسمانوں میں پرواز کرنے والے پرندوں کے لئے چند لقمے چھوڑ دیتا۔

شام کو وہ شمالی لبنان کے کھیرٹوں اور گاؤں سے الگ پڑی اپنی نہایت مفلس جھونپڑی میں واپس آ جاتا۔ شام کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے والدین کے پاس بیٹھ جاتا، جو اسے گزشتہ دور کی کہانیاں سناتے، وہ ان کی باتوں کو غور سے سنتا رہتا جب تک نیند اسے لبھا کر اس کی آنکھوں پر قبضہ نہ جما لیتی۔

موسم سرما میں وہ اپنے ایام انگلیٹھی کے ارد گرد گزارتا، اور ہواؤں کی چیخ و پکار اور عناصر کی آہ و بکا پر غور کرتا، موسموں کے مظاہر کے بارے میں سوچتا اور کھڑکیوں کے باہر برف سے ڈھکی ہوئی ان وادیوں اور بے برگ و بار درختوں کو دیکھتا جو ان مصیبت زدہ انبوہ کی علامت پیش کرتے تھے، جو

کاٹ کھانے والے پالے کی سردی اور تیز ہواؤں کے جبروں میں بے یار و مددگار تھے۔

موسم سرما کی لمبی راتوں میں وہ تب تک بیٹھا رہتا جب تک کہ اس کے والدین سونے نہ چلے جاتے، اس کے بعد وہ لکڑی کی ایک بھدی الماری کو کھول کر انجیل نکالتا اور ایک ٹمٹماتے چراغ کی دھندلی روشنی میں اسے چپکے چپکے پڑھا کرتا۔ پادری حضرات نے ”باببل“ کے پڑھنے پر اعتراض کر رکھا تھا، اور جان، مطالعہ کے ان دلربا لمحوں میں، انتہائی احتیاط سے کام لیتا۔ بشپ حضرات نے سادہ لوح عوام کو یہ تشبیہ کیا ہوا تھا وہ اس کتاب کو نہ پڑھیں، اور انہوں نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ جن لوگوں کے پاس یہ کتاب ملے گی ان کا برادری سے اخراج کیا جائے گا۔

اس طرح جان کی جوانی خدا کی خوبصورت زمین اور نور و صداقت سے لبریز اس عہد نامہ جدید کے درمیان گزری۔ جان خاموش اور غور و تدبر کرنے والا نوجوان تھا؛ وہ اپنے والدین کی گفتگو کو دھیان سے سنتا لیکن کبھی منہ سے کوئی لفظ نہ نکالتا، نہ ہی کوئی سوال کرتا۔ جب وہ اپنے ہم عصروں کے درمیان بیٹھتا تو وہ دور افتق کو غلنگلی باندھ کر دیکھتا، اور اس کے خیالات بھی اتنے ہی نارسا ہوتے جتنی کہ اس کی آنکھیں۔ کلیسا میں جانے کے بعد جب جب وہ گھر واپس آتا تو اس کی روح غموں سے چور ہوتی کیونکہ پادریوں کی

تعلیمات اس کے انجیل میں پائے ہوئے فہم و شعور سے بالکل الگ تھیں اور باایمان اشخاص کی زندگیاں حضرت عیسیٰ کی بیان کردہ خوب صورت زندگیاں نہیں تھیں۔

ہمارا موسم آیا اور کھیتوں اور وادیوں میں برف پگھل گئی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر موجود برف آہستہ آہستہ پگھل کر چھوٹے چھوٹے آجڑوں کی صورت اختیار کر کے وادی کی جانب بڑی پیچ کھاتی ہوئی راہوں سے بہہ نکلی، اور مل کر تیز دھارا بن گئی جس کی دھاڑ فطرت کی بیداری کی شاہد تھی۔ بادام اور سیبوں کے شجر پھولوں سے کھلے ہوئے تھے؛ بید مجنوں اور سفیدہ کے درختوں پر کونیل پھوٹنے لگیں، اور فطرت نے اپنا خوش اندام و رنگین پیرہن دیہات کے علاقوں پر پھیلا دیا۔

جان نے لب انگلیٹھی اپنے دن گزارنا ترک کر دیا اور یہ معلوم ہونے کے سبب کہ اس کے بیل چراگاہ کی دیرانہ چاہت میں تھے، وہ گوال گھر سے اپنے مویشیوں کو کھول کر انہیں سبزہ زار میں لے گیا؛ کسی کو معلوم نہ ہو، اس ڈر سے اس نے انجیل کو اپنے چونے میں چھپا رکھا تھا۔ وہ ایک خوبصورت کنج میں پہنچا جو قریب ہی کی پہاڑی پر شان و شوکت کے ساتھ کھڑی سینٹ ایجا کی خانقاہ کی زیر ملکیت کچھ کھیتوں سے متصل تھا۔ جب بیلوں نے چرنا شروع کیا تو جان، اپنی پیٹھ کو ایک چٹان کا سہارا دے کر، اپنی انجیل پڑھنے

لگا، اور وہ اس کرۂ ارض پر خدا کے بچوں کے رنج و غم اور سلطنتِ فردوس کی دلکشی پر غور و فکر کرنے لگا۔

لینٹ (حضرت عیسیٰؑ کی یاد میں چالیس روزوں کی نفس کشی) کا آخری دن تھا، اور اس دوران گوشت کھانے سے پرہیز کرنے والے گاؤں کے باشندے بے صبری سے ایسٹر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ باقی غریب کسانوں کی ہی مانند، جان کبھی لینٹ اور دیگر ایام میں فرق نہیں کرتا تھا، کیونکہ اس کی تمام زندگی ایک طویل لینٹ ہی تو تھی۔ اور اس کی خوراک اپنے دردِ دل سے گوندھی ہوئی سادہ روٹی یا اپنے جسم کے خون سے خریدے ہوئے میوہ جات سے زائد کبھی نہ تھی۔ لینٹ کے دوران جان محض جس غذا کی تمنا کرتا تھا وہ روحانی غذا تھی—جو وہ آفاقی روٹی تھی جو اس کے دل میں عیسیٰؑ کے المیہ اور اس زمین پر اُن کی زندگی کے خاتمہ کے غمگین خیالات لاتی تھی۔

پرندے اس کے ارد گرد چہچہا رہے تھے اور منڈلا رہے تھے، فاختاؤں کے بڑے بڑے جھنڈ آسمان کے چکر کاٹ رہے تھے، جبکہ بادِ نسیم کے اشاروں پر پھول ایسے جھوم رہے تھے گویا کہ سورج کی شاندار روشنی نے انہیں شگفتہ کیا ہو۔

جان کتاب کو جذب کرنے میں مشغول ہو گیا، اور ان بے حد حساس، روشن ضمیری بخشنے والے لمحات کے درمیان وہ قریب کے گاؤں سے ابھرتے

کلیساؤں کے گنبدوں کو دیکھتا اور گھنٹیوں کی متوازن گونجیں سنتا رہا۔ گا ہے
 گا ہے وہ اپنی آنکھیں بند کر کے خوابوں کے پروں سے اڑ کر قدیم یروشلم
 کی سیر کرتا، جہاں وہ حضرت عیسیٰؑ کے قدموں کی اتباع کرتا اور ناصرہ کے
 باشندوں سے حضرت عیسیٰؑ کی باتیں پوچھتا؛ جس پر اسے یہ جواب ملتا، ”یہاں
 انھوں نے کوڑھیوں کو شفا بخشی اور نابیناؤں کو بینائی؛ اور وہاں لوگوں نے اُن
 کے لئے کانٹوں کا سہرا بنایا اور ان کے سر پر باندھا؛ اُس برآمدے میں کھڑے
 ہو کر وہ خوبصورت تمثیلوں سے عوام سے ہمکلام ہوئے؛ اُس محل میں لوگوں
 نے ان کو سنگِ مرمر کے ستونوں سے باندھ کر کوڑے لگائے؛ اس سڑک پر
 انھوں نے زانیہ کے گناہوں کو معاف کیا؛ اور اُس جگہ وہ اپنی صلیب کے بار
 تلے گر گئے۔“

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ جان جسمانی طور پر خدا میں ڈوب گیا تھا اور روح سے
 اس کی حمد و ثنا کر رہا تھا۔ جلد ہی دوپہر ہو گئی اور بیل جان کی نظروں
 سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اس نے ہر سمت میں نگاہ دوڑائی، لیکن وہ اسے نظر
 نہ آئے، اور جیسے ہی وہ قریب کے کھیتوں میں جانے والی پگڈنڈی پر پہنچا اس
 کو دور باغوں کے درمیان کھڑا ایک آدمی نظر آیا۔ جب وہ اس کے قریب
 پہنچا اور دیکھا کہ وہ خانقاہ کا ایک راہب تھا، جان نے اسے سلام کیا اور تعظیم
 و تکریم سے سر جھکایا، اور اس سے دریافت کیا کہ آیا اس نے بیلوں کو کہیں

دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ راہب اپنے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا؛ اور اس نے کہا، ”ہاں، میں نے ان کو دیکھا۔ میرے پیچھے پیچھے چلو، اور میں تمہیں ان بیلوں کو دکھاؤں گا۔“ جب وہ خانقاہ میں پہنچے تو جان نے اپنے بیلوں کو ایک چھپر میں رسیوں سے بندھا ہوا پایا۔ ایک راہب ان کی نگرانی پر مقرر تھا، جب بھی ان میں کوئی بیل حرکت کرتا تو وہ اس کی پیٹھ پر ایک بھاری ڈنڈا رسید کرتا۔ جان نے بے یار و مددگار مویشیوں کو کھولنے کی ایک مضطربانہ کوشش کی، لیکن راہب نے اس کا چوغہ پکڑ کر اسے بند کر لیا۔ اسی وقت اس نے خانقاہ کی طرف رخ کر کے بہ آواز بلند پکارا، ”یہاں ہے وہ مجرم چرواہا، میں نے اسے پالیا ہے۔“ صدر پادری کے پیچھے پیچھے باقی پادری اور راہبان جلدی سے موقع پر آئے اور انہوں نے جان کو گھیر لیا۔ جان حیران ہو گیا، اور وہ خود کو ایک قیدی محسوس کر رہا تھا۔ جان نے صدر پادری سے کہا، ”میں نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا ہے کہ میرے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ کیا جائے۔“ صدر پادری نے غصہ سے جواب دیا، ”تمہارے بیلوں نے ہمارے پیڑ پودوں کو روند ڈالا ہے اور ہمارے انگور کی بیلوں کو تباہ کر دیا ہے۔ چونکہ تم اس نقصان کے ذمہ دار ہو، جب تک تم ہمارے نقصان کی بھرپائی نہیں کرتے، ہم تمہارے بیلوں کو نہیں چھوڑیں گے۔“

جان نے اعتراض جتایا، ”میں غریب ہوں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“

خدارا میرے بیلوں کو رہا کر دیجئے، میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں انہیں ان کھیتوں کے پاس کبھی نہیں لاؤں گا۔“ صدر پادری ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا، ”خدا نے ہمیں سینٹ ایجا خانقاہ کی اس وسیع زمین کا محافظ مقرر کیا ہے، اور یہ ہمارا مقدس فریضہ ہے کہ ہم اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کی حفاظت کریں، کیونکہ یہ زمین پاک ہے، اور، آگ کی مانند، یہ ہر اس شخص کو جلا دے گی جو اس پر بلا اجازت قدم رکھے گا۔ اگر تم خدا کے خلاف اپنے جرم کا حساب دینے پر راضی نہیں ہوتے تو وہ گھاس جسے تمہارے بیلوں نے کھایا ہے یقیناً زہر بنے گی اور انہیں ہلاک ہی کر دے گی۔“

صدر پادری جانے لگا لیکن جان نے اس کا لبادہ چھو کر عاجزی کے ساتھ منت کی، ”میں آپ سے عیسیٰ اور تمام سنتوں کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ آپ مجھے اور میرے مویشیوں کو چھوڑ دیں۔ مجھ پر رحم کیجئے کیونکہ میں غریب ہوں اور اس خانقاہ کی تجوریاں چاندی اور سونے سے لبریز ہیں۔ میرے غریب اور عمر رسیدہ والدین پر رحم کھائیے، جن کی زندگیاں صرف مجھ پر ہی منحصر ہیں۔ اگر میں نے آپ کو نقصان پہنچایا ہے، خدا مجھے معاف کر دے گا۔“ صدر پادری نے اس پر خشونت سے نگاہ ڈالی اور کہا، ”تم چاہے غریب ہو یا مالدار، یہ خانقاہ تمہارے قرض کو معاف نہیں کر سکتی ہے۔ تمہارے بیلوں

کی آزادی کے لئے تین دینار لگیں گے۔“ جان نے التجا کی، ”میرے پاس تو ایک سکہ بھی نہیں ہے؛ فادر، ایک غریب چرواہے پر رحم کیجئے۔“ صدر پادری نے فوراً جواب دیا، ”تب تو تمہیں تین دینار لانے کے لئے اپنی ملکیت کا ایک حصہ فروخت کرنا چاہئے، کیونکہ اپنے آپ پر سینٹ ایجا کا غصہ لانے اور جہنم میں جانے سے بہتر آسانی سلطنت میں بغیر جائیداد داخل ہونا ہے۔“ دوسرے پادریوں نے تائید میں سر ہلایا۔

مختصر خاموشی کے بعد جان کا چہرہ روشن ہوا، اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، گویا کہ خوف اور غلامی اس کے دل سے نکل چکے ہوں۔ اپنا سر اٹھا کر اس نے صدر پادری کو دیکھا اور بہادری کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا، ”کیا خانقاہ کی دولت میں مزید سونے کا اضافہ کرنے کے لیے غریبوں کو اپنی وہ معمولی سی جائیداد بھی فروخت کرنی پڑے گی جو ان کی دو وقت کی روٹی کا ذریعہ ہے؟ کیا یہی انصاف ہے کہ غریبوں پر ظلم کیا جائے اور انھیں غریب تر بنا دیا جائے تاکہ سینٹ ایجا بیلوں کی معصوم خطاؤں کو درگزر کریں؟“ صدر پادری نے اپنی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھائیں اور لحن میں کہا، ”خدا کی کتاب میں لکھا ہے کہ جس کے پاس وافر مقدار میں مال ہے اسے مزید عطا کیا جائے گا، اور جس کے پاس دولت نہیں ہے اس سے مزید لیا جائے گا۔“ یہ الفاظ سن کر جان غصے سے بے قابو ہو گیا اور دشمن کے سامنے اپنی

تلوار کو کھینچ لینے والے سپاہی کی مانند، اس نے اپنی جیب سے انجیل نکالی اور چلا کر کہا، ”اس طرح تم عیسیٰ کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہو، تم منافق! اور اسی طرح سے تم اپنی بدطینتی کو پھیلانے کے لئے زندگی کی سب سے مقدس میراث کو ہی بدخصلت بنا دیتے ہو۔ رنج و الم تم پر برسے! جب حضرت عیسیٰ دوبارہ آئیں اور تمہاری خانقاہ کو تہس نہس کر دیں، اور اس کے ملبہ کو وادی میں پھینک دیں اور تمہارے مزار اور جائے نیاز کو جلا کر راکھ کر دیں... رنج و الم تم پر برسے! جب عیسیٰ کا غضب تم پر نازل ہو اور وہ تمہیں ہسپتال میں پھینک دیں... رنج و الم تم پر برسے! تم حرص کے بتوں کی پوجا کرنے والو، جو اپنے کالے پیرہنوں کے نیچے نفرت کی بدصورتی کو چھپاتے ہو... رنج و الم تم پر برسے! اے حضرت عیسیٰ کے دشمنو، جو دعاؤں کے الفاظ کے ساتھ اپنے ہونٹ ہلاتے ہو جبکہ تمہارے دل ہوس سے لدے ہوئے ہیں... رنج و الم تم پر برسے! جو جائے نیاز کے سامنے اپنا سر جھکاتے ہو جبکہ تمہاری روہیں خدا سے بغاوت کر رہی ہوتی ہیں! میرے اور میرے آباء و اجداد کے ذریعے تمہارے لیے قیمت چکائی ہوئی اس زمین کے پاس پہنچنے کے لیے مجھے سزا دینے والو، تم اپنے ہی گناہ کی وجہ سے غلیظ و گندے ہو۔ جب میں نے حضرت عیسیٰ کے نام پر تم سے رحم کی درخواست کی، تو تم نے میری تضحیک کی۔ پکڑ لو یہ کتاب، اور اپنے مسکراتے ہوئے راہبوں کو

یہ دکھلا دو کہ خدا کے بیٹے نے کہاں کسی بھی صورت میں معافی دینے سے انکار کیا... اس آفاقی المیہ کو پڑھو اور انہیں بتلاؤ کہ کہاں کہاں اس نے رحم اور مہربانی کی بات نہیں کی ہے، چاہے وہ پہاڑی پر دیا گیا درس ہو یا معبد میں کی گئی نصیحت۔ کیا اس نے زانیہ عورت کے گناہوں کو معاف نہیں کیا؟ کیا صلیب پر انہوں نے اپنے ہاتھ انسانیت کو گلے لگانے کی خاطر نہیں پھیلانے؟ ہمارے خستہ حال گھروں کو دیکھو جہاں مریض اپنے سخت بستروں پر بیماری کے دن کاٹتے ہیں.... قید خانہ کی سلاخوں کے پیچھے نظر ڈالو جہاں معصوم شخص ظلم اور ناانصافی کا ستم رسیدہ ہیں؛ گداگروں کو دیکھو جو باطن میں ذلیل ہوئے ہیں، جسموں سے شکستہ حال ہیں، اور صدقہ کی خاطر دستِ سوال دراز کئے ہوئے ہیں... تمہاری اتباع کرنے والے اپنے غلاموں کے بارے میں سوچو جو بھوک کی ٹیسیں سہ رہے ہیں جبکہ تم عیش و عشرت اور بے اعتنائی کی زندگی گزار رہے ہو اور کھیتوں کے میوہ جات اور انگور کے باغات کی شراب سے لطف اندوز ہو رہے ہو۔ تم نے کبھی دکھ کے مارے شخص کی عیادت نہیں کی، مغموم شخص کو تسلی نہیں دی، نہ ہی کسی بھوکے کو کھانا کھلایا؛ نہ ہی تم نے کبھی مسافر کو اپنے یہاں پناہ دی اور نہ کسی معذور کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ پھر بھی ہمارے آباء و اجداد سے چوری کی ہوئی دولت پر تم مطمئن نہیں ہو اور ابھی بھی اپنے ہاتھوں کو سانپ کے پھن کی مانند پھیلا رہے ہو، اور جہنم

کی دھمکی دے کر وہ چھین رہے ہو جو بھی تھوڑا سا کسی بیوہ نے جان توڑ
 محنت کر کے اکٹھا کیا ہو یا کسی پریشان حال کسان نے اپنے بچوں کو زندہ رکھنے
 کی خاطر جمع کیا ہو۔“

جان نے ایک گہری سانس لی، پھر اپنی آواز کو پرسکون کیا اور دھیرے
 سے یہ بھی کہا، ”تم تعداد میں کئی ہو جبکہ میں تنہا ہوں—تم جو چاہو میرے
 ساتھ کر سکتے ہو؛ بھیڑیے میمنہ کا رات کی تاریکی میں شکار کرتے ہیں لیکن
 وادی کے پتھروں پر خون کے دھبے رہ جاتے ہیں اور جب سحر ہوتی ہے تو
 سورج اپنی کرنوں کو بکھیر کر اس جرم کو سب پر عیاں کر دیتا ہے۔“

جان کی باتوں کی ایک جادوئی طاقت تھی جس کی وجہ سے وہ اس کی باتوں
 میں محو توجہ رہے اور جس نے راہبوں کے دلوں کو مدافعانہ غصے سے بھر
 دیا۔ وہ غصے سے کانپ رہے تھے اور جان پر ٹوٹ پڑ کر اسے اطاعت پر مجبور
 کرنے کے لئے وہ صرف اپنے سربراہ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مختصر
 سی خاموشی طوفان کے اس بوجھل سکوت کی مانند تھی جسے وہ بانگوں کو برباد
 کر دینے کے بعد اختیار کرتا ہے۔ صدر پادری نے تب راہبوں کو یہ کہتے ہوئے
 حکم دیا، ”اس مجرم کو باندھ لو؛ یہ کتاب اس سے چھین لو اور اسے ایک کالی
 کوٹھڑی میں گھسیٹ کر لاؤ؛ کیونکہ جو کوئی بھی خدا کے مقدس نمائندوں کی
 توہین کرتا ہے اسے نہ تو کبھی اس دنیا میں معافی مل سکتی ہے اور نہ ہی ابدی

دنیا میں۔“ تب راہب حضرات جان پر جھبٹے اور اسے بیڈیوں سے جکڑ کر ایک تاریک کوٹھری میں لے گئے اور وہیں اسے بند کر دیا۔

جان نے جس ہمت کا مظاہرہ کیا اس کا غلامی یا دھوکے یا ظلم و جبر کا کوئی نمک خور ادراک نہیں کر سکتا تھا—جو استبداد اس غلام ملک، جسے مشرقی لوگ ”ملکِ شام کی دلہن“ اور ”سلطان کے تاج کا موتی“ کہتے ہیں۔ جن چیزوں کا جان کو حال ہی میں علم حاصل ہوا تھا، ان چیزوں کی جکڑ میں ہونے کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں پر پڑی بلا ضرورت مصیبتوں کے بارے میں جان نے اپنی کوٹھری میں سوچ و چار کیا۔ ایک غمگین ہمدردی سے وہ مسکرایا؛ اور اس کی مسکراہٹ میں رنج و غم اور تلخی ملی ہوئی تھی؛ جس کی نوعیت ایسی تھی کہ دل کی گہرائیوں سے اپنا راستہ کاٹ کر باہر نکلتی ہے؛ جس کی نوعیت ایسی تھی کہ روح کو گلا گھونٹنے والی لاحاصل کی طرف مائل کرتی ہے؛ جس کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے اگر مدد نہ ملے تو آنکھوں میں چڑھ کر بے بس، نیچے ٹپک جاتی ہے۔

جان تب فخر کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور دھوپ میں نہائی ہوئی وادی کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی دراڑ سے دیکھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا ایک روحانی شادمانی اس کی روح کو گلے لگا رہی تھی اور ایک میٹھا سکون اس کے دل پر چھا رہا تھا۔ پادریوں نے اس کے جسم کو قید کر لیا تھا، لیکن

اس کی روح ٹیلوں اور گھاس کے میدانوں میں آزادی سے نسیم کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے تئیں اس کی محبت میں کبھی تبدیلی نہیں آئی، اور دستِ ایذا اس کے دل کے چین کو ہٹا نہ سکے، کیونکہ ایذا رسانی اس شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہے جو سچ پر قائم رہتا ہے۔ کیا سقراط فخر کے ساتھ جسمانی طور پر ہلاک نہیں ہوا؟ کیا سنت پال کو سچائی کی خاطر سنگسار نہیں کیا گیا؟ یہ ہمارا باطن ہے جو نافرمانی کی صورت میں ہمیں زخمی کرتا ہے اور دھوکہ دینے کی حالت میں ہمیں مار ڈالتا ہے۔

جان کے والدین کو اس کی گرفتاری اور بیلوں کی ضبطی کی اطلاع دی گئی۔

اس کی بوڑھی ماں اپنی لاٹھی کا بہت زیادہ سہارا لئے ہوئے خانقاہ میں حاضر ہوئیں، اور انھوں نے صدر پادری کے سامنے سجدہ کیا، اس کے پیر چومے اور اپنے بیٹے پر رحم کھانے کی منت سماجت کی۔ صدر پادری نے اپنا سر آسمان کی طرف مودبانہ انداز میں اٹھا کر کہا، ”ہم تمہارے بیٹے کے جنون کے لیے اسے معاف کر دیں گے لیکن سینٹ ایجا کسی بھی ایسے شخص کو معاف نہیں کریں گے جو ان کی زمین میں بلا اجازت داخل ہوا ہو۔“ آنسو بھری آنکھوں سے، تکتی نظروں سے، صدر پادری کو دیکھنے کے بعد بوڑھی عورت نے اپنے گلے سے چاندی کا لاکٹ نکالا اور اسے صدر پادری کو یہ کہتے ہوئے دے دیا، ”یہ میرے پاس کی سب سے قیمتی چیز ہے، جو میری والدہ نے شادی کے

تخنے کے طور پر دیا تھا... کیا آپ اسے میرے بیٹے کے گناہ کے کفارہ کے طور پر قبول کریں گے؟“

صدر پادری نے لاکٹ لے کر اسے اپنی جیب میں ڈال دیا، تب اس نے جان کی عمر رسیدہ امی کو دیکھا، جو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہی تھیں اور اس کے تئیں اپنے شکر و امتنان کا اظہار کر رہی تھیں، اور اس نے کہا، ”اس گناہگار زمانے کا برا ہو، تم انجیل کی باتوں کو توڑتے مروڑتے ہو اور اپنے بچوں کو ناپاک کھانا کھلاتے ہو اور والدین اپنے بچوں کو کسی بھی تصور کے لیے ڈانٹتے نہیں ہیں۔ اب جاؤ، بھلی عورت، اور اپنے پاگل بیٹے کے لئے خدا سے دعا کرو، اور اسے منت مانگو کہ وہ اس کی مغز بحالی کرے۔“

جان قید خانہ سے نکل گیا، اور اپنی ماں کے بغل میں خاموشی کے ساتھ اور بیلوں کو اپنے آگے آگے ہانکتے ہوئے چلتا رہا۔ جب وہ اپنی نہایت مفلس جھونپڑی میں پہنچے تو جان نے مویشیوں کو ناند پر لگا دیا اور خود کھڑکی کے پاس خاموش بیٹھ کر غروبِ آفتاب پر تفکر کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے والد کو اس کی ماں سے سرگوشی کرتے ہوئے سنا، ”سارہ، میں نے تمہیں کئی بار بتایا تھا کہ جان پاگل ہے، اور تم نے بھروسہ نہ کیا۔ آج یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد تم یہ بات تسلیم کرو گی چونکہ صدر پادری نے تم سے وہی باتیں کہیں جو میں تم سے گزشتہ کئی سالوں سے کہتا چلا آیا ہوں۔“ جان مسلسل

دور، افق پر نظریں گاڑ کر غروبِ آفتاب کا نظارہ کرتا رہا۔
 ایسٹر آیا، اور اس وقت بشہری قصبہ میں ایک نئے گرجاگھر کی تعمیر کا کام
 حال ہی میں مکمل ہوا تھا۔ عبادت کی یہ عظیم الشان عمارت کسی شہزادے کے
 محل جیسی تھی جو غریب رعایا کی جھونپڑیوں کے بیچ کھڑی تھی۔ لوگ اس
 اسقف کا استقبال کرنے کے لئے جلدی جلدی بہت سی تیریاں کر رہے تھے،
 جو نئے معبد کے افتتاح کی مذہبی تقریبات کی انجام دہی پر مقرر کیا گیا تھا۔
 عام لوگوں کی بھیڑ عالی جاہ کی آمد کا انتظار سڑکوں پر قطار در قطار کھڑے ہو
 کے کر رہی تھی۔ جھانچھوں کی آوازوں کے بیچ بلند ہونے والے پادریوں کے ہم
 آہنگ دعائیہ الفاظ اور بھیڑ کی حمد نے آسمانوں کو بھر دیا۔

جس کی زین میں سونا جڑا ہوا تھا، ایسے ایک شاندار گھوڑے پر سوار ہو کر
 بالاخر اسقف آگیا، اور جیسے ہی وہ گھوڑے سے اترا، پادری اور سیاسی رہنماؤں
 نے خوبصورت ترین استقبالیہ خطبہ سے اس کو خوش آمدید کہا۔ اسے نئی نیازگاہ
 تک لے جایا گیا، جہاں اس نے خود کو سونے کے دھاگوں سے مزین اور
 چمچماتے جواہرات سے جڑے ہوئے کلیسائی پوشاک میں ملبوس کیا۔ اس نے اپنا
 طلائی تاج پہنا اور جواہرات سے مرصع اپنی عصا کو لئے ہوئے اس نے نیازگاہ
 کے ارد گرد اہلکاروں کے جہوم کے ساتھ کئی چکر لگائے۔ اس کے پیچھے پیچھے
 پادری اور چراغ و مکدر، دھویں کے مرتبان اٹھانے والے اشخاص قدم بہ

قدم چل رہے تھے۔

اس وقت جان برآمدے میں کسانوں کے مابین کھڑا اس منظر پر تلخ آہوں

اور دکھی آنکھوں سے تفکر کر رہا تھا، کیونکہ اسے از حد مہنگے پیراہن، بیش

قیمت تاج، عصا اور گلدان اور بلا ضرورت فضول خرچی کی دوسری چیزیں دیکھ کر تکلیف ہوئی جبکہ ارد گرد کے گاؤں سے تہوار منانے کے لئے آئے ہوئے

غریب کسان مفلسی کی ٹیسیں جھیل رہے تھے۔ ان کے پھٹے پرانے لباس اور

غمزہ چہرے ان کی بدترین حالت کی تصویر پیش کر رہے تھے۔

بلے اور فیتے لگائے ہوئے مالدار معزز عہدیدار دور کھڑے ہو کر زور زور

سے دعا کر رہے تھے، جبکہ مصیبت زدہ گاؤں والے اس منظر کی سب سے

پچھلی صف میں اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں کی تہ سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ

اپنی چھاتیاں پیٹ رہے تھے۔

ان معزز عہدیداروں اور رہنماؤں کا اقتدار درختِ حور کے سدا بہار پتوں کی

مانند تھا، اور ان کسانوں کی زندگائیاں ایک ایسی کشتی کی مانند تھیں جس کا ملاح

لقمہ اجل ہو چکا ہو اور جس کا پتوار گم ہو گیا ہو اور جس کا بادبان آندھی سے

پھٹ گیا ہو اور جو غضبناک گہرائی اور زبردست طوفان کے رحم و کرم پر ہو۔

ظلم و جبر اور اندھی اطاعت... ان دو میں سے کس نے کس کو پیدا کیا؟

کیا ظلم و جبر ایک مضبوط درخت ہے جو نشیبی زمین میں نہیں اگتا ہے، کیا

یہ اطاعت ہے، جو ایک بنجر زمین کی مانند ہے جہاں کانٹوں کے علاوہ اور کچھ نہیں اگ سکتا؟ ایسے خیالات اور تفکرات نے جان کے دماغ کو اپنی زد میں لیا، جب رسوم کی ادائیگی ہو رہی تھی؛ اس نے اپنی باہوں کو اپنے سینے پر باندھا کہ کہیں اس کا سینہ، اس متضاد کے المیہ میں، لوگوں کی حالتِ زار کے درد سے پھٹ نہ جائے۔

اس نے سنگ دل انسانیت کی مرجھاتی مخلوقات پر نظریں گاڑ کر دیکھا، جن کے دل خشک تھے اور جن کے بیج اب زمین کی چھاتی میں ایسے پناہ لے رہے تھے جیسے کہ مصیبت کے مارے زائر ایک نئے قلمرو میں دوبارہ پیدائش کے متلاشی ہوں۔

جب دھوم دھام ختم ہوئی اور عوام اب منتشر ہونے کو تھی، جان کو محسوس ہوا کہ کوئی مجبور کرنے والی طاقت اسے مظلوم غریبوں کی جانب سے بولنے پر مجبور کر رہی ہے۔ وہ میدان کے ایک الگ کنارے پر گیا، اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کیا، اور جب بھیڑ اکٹھا ہو گئی تو اس نے لب کھولے اور کہا، ”اے عیسیٰ، جو ہالہء نور کے دل میں بیٹھتے ہو، میری بات سنو! نیلے گنبد کے پیچھے سے اس زمین پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ کانٹوں نے کس طرح سے ان پھولوں کا گلا گھونٹ رکھا ہے جن کو تمہاری صداقت نے لگایا تھا۔

”اے عمدہ چرواہے، بھیڑیوں نے اس کمزور مہینے کا شکار کر دیا ہے جسے تم

نے اپنے بازوؤں سے اٹھایا تھا۔ تمہارا پاکیزہ خون زمین کی ان گہرائیوں میں بہایا گیا ہے جنہیں تمہارے قدموں نے مقدس بنایا تھا۔ اس اچھی زمین کو تمہارے دشمنوں نے ایک اکھاڑا بنا رکھا ہے جہاں طاقتور لوگ کمزوروں کو پکچل رہے ہیں۔ بدحال اشخاص کی چیخ اور لاچار لوگوں کا کھرام تمہاری بات کی تبلیغ کرنے والے تخت نشینوں کو اب نہیں سنائی دیتے ہیں۔ اس زمین پر تمہارے بھیسے ہوئے مہینے اب بھیرے ہو گئے ہیں، جو اسے کھا رہے ہیں جسے تم ڈھویا کرتے تھے اور جسے تم نے فیض یاب کیا تھا۔

"نور کا پیغام جو تمہارے دل سے نمودار ہوا تھا، وہ اب مقدس صحیفوں سے فنا ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک لامعنی اور وحشت ناک شور و غوغا نے لے لی ہے، جو روح کو دہشت زدہ کرتی ہے۔

"اے حضرت عیسیٰ! ان لوگوں نے یہ گرجا گھر اپنی ذاتی شان و شوکت کے لیے تعمیر کئے ہیں، اور انہیں ریشم اور پکھلے ہوئے سونے سے آراستہ کیا ہے.... انھوں نے تمہارے عزیز غرباء کے اجسام کو ٹھنڈی رات میں پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹا چھوڑ دیا ہے.... انھوں نے جلتی شمعوں اور مشکدار دھوؤں سے آسمان کو بھر دیا ہے اور تمہارے وفادار عبادت گزاروں کے اجسام کو روٹی سے محروم کیا.... انہوں نے بہ آواز بلند مدح سرائی کی لیکن بیواؤں اور یتیموں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا سننے میں خود کو بہرا بنا دیا۔

"ایک بار پھر سے آؤ، اے زندہ جاوید حضرت عیسیٰؑ، اور تمہارے عقیدے کے دکانداروں کو اپنے مقدس معبد سے نکال باہر کر دو، کیوں کہ انھوں نے اس عبادت خانے کو ایک تاریک غار میں بدل دیا ہے جہاں منافقت اور جھوٹ کے سانپ رہنکتے رہتے ہیں اور بے شمار ہیں۔"

جان کے مضبوط اور اخلاص سے بھرے الفاظ نے لوگوں سے اتفاق کی سرسراہٹ پیدا کی، اور معزز عہدیداروں کے قریب پہنچنے نے اس طرز عمل کو اثر انداز نہ کیا۔ مزید ہمت کے ساتھ، جس میں سابقہ تجربہ کے باعث اور بھی طاقت در آئی تھی، اس نے اپنی بات جاری رکھی، "آؤ حضرت عیسیٰؑ، اور ان قیصروں سے حساب لو جنہوں نے کمزوروں سے کمزوروں کے اور خدا سے خدا کے حقوق ہڑپ کر لئے۔ وہ انگور کا باغ جس کو تم نے اپنے داہنے ہاتھ سے لگایا تھا، اسے حرص کے کیرنوں نے کھا لیا ہے اور ان کے گچھوں کو روند ڈالا ہے۔ تمہارے امن کے بیٹے آپس میں منقسم ہیں اور وہ سرمائی کھیت میں غریب روحوں کو ستم رسیدہ چھوڑ کر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ تمہاری نیازگاہ کے سامنے وہ اپنی آوازیں دعاؤں کے ساتھ بلند کرتے ہیں، کہ "خدا کی تمجید عظیم تر ہو، اور کرہ ارض پر امن ہو؛ لوگوں کی ایک دوسرے پر نوازش ہو۔" لیکن کیا آسمانوں میں موجود ہمارے باپ کی تمجید ہو گی جب اس کا نام کھوکھلے دلوں، گنہگار ہونٹوں اور باطل زبانوں سے لیا جائے؟ کیا زمین پر امن

ہو گا جب مضبوط لوگوں کو کھلانے اور ظالموں و جابروں کے پیٹوں کو بھرنے کی خاطر، مصیبتوں کی اولادیں کھیتوں میں غلامی کرتے ہوں؟ کیا ان پر کبھی امن و امان چھائے گا اور انہیں مفلسی کے پنجوں سے نجات دلائے گا؟

"امن و امان کیا ہے؟ کیا یہ ان نومولود بچوں کی آنکھوں میں ہے جو

ٹھنڈی جھونپڑیوں میں اپنی بھوکی ماؤں کے سوکھے ہوئے پستانوں سے غذا حاصل کر رہے ہیں؟ یا یہ بھوکوں کے نہایت بدحال چھپروں میں ہے جو سخت بستروں پر سوتے ہیں اور جو اُس کھانے کے متمنی ہوتے ہیں جسے پادری اور راہب اپنے موٹے خنزیروں کو کھلاتے ہیں؟

"خوشی کیا ہے: اے جمیل عیسیٰ مسیح؟ کیا یہ تب آشکارا ہو جاتی ہے جب

امیر شہر موت کی دھمکیوں سے یا چاندی کے چند سکوں کے عوض آدمیوں کے مضبوط بازو یا عورتوں کی عصمت کا سودا کرتا ہے؟ یا کیا اس کی یافت ان لوگوں کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرنے اور ان کی بندگی قبول کرنے میں ہے جو اپنے چمکتے ہوئے بلوں اور سنہرے مکٹوں کے ذریعہ ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں؟ تمہارے امن بپا کرنے والوں کے سامنے شکایت کرنے پر وہ ہمیں، تلواروں اور بھالوں سے لیں، اپنی فوجوں سے نوازتے ہیں، جو ہماری عورتوں اور بچوں پر دھاوا بول دیتی ہیں اور ہمارا خون چرا لیتی ہیں۔

"اے عیسیٰ مسیح، محبت اور رحم سے لبریز عیسیٰ مسیح! اپنے مضبوط بازوؤں

کو پھیلاؤ اور ہمیں ان چوروں سے بچاؤ، یا مہربان موت کو ہماری نجات کے لیے بھیج دو کہ وہ ہمیں قبروں تک پہنچا دے، جہاں ہم تمہاری صلیب کی نگراں دیکھ بھال میں سکون سے آرام کر سکیں گے؛ وہاں ہم تمہاری واپسی کا انتظار کریں گے۔ اے طاقتور عیسیٰ مسیح! یہ زندگی کچھ بھی نہیں، محض غلامی کی ایک تاریک کوٹھری ہے۔ یہ دہشتناک جنوں کا کھیل میدان ہے، اور یہ گڑھا ہے جو موت کے آسیبوں سے زندہ و جاوید ہے۔ ہمارے دن محض تیز دھاردار تلواریں ہیں جو رات کی وحشت ناک تاریکی میں ہماری پھٹی پرانی رضائیوں کے نیچے چھپی ہوئی ہیں۔ صبح کے وقت یہ ہتھیار ہمارے سروں کے اوپر بھوتوں کی مانند اٹھتے ہیں اور کوڑوں کے بل بوتے پر قائم ہماری غلامی کو کھیت کا راستہ دکھاتے ہیں۔

"اے عیسیٰ مسیح! مظلوم غریبوں پر رحم کرو، جو آج تمہاری دوبارہ آمد کا جشن منانے کے لئے آئے ہیں... ان پر ترس کھاؤ کیوں کہ وہ بد حال اور کمزور ہیں۔"

جان کی باتیں ایک جماعت کے دلوں کو بھاگئیں جب کہ دوسری جماعت کو یہ ناگوار معلوم ہوئیں۔ ایک شخص نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا، "وہ سچ کہہ رہا ہے اور ہماری جانب سے الہامی سلطنت سے گزارش کر رہا ہے۔" تو ایک دوسرے شخص نے کہا، "یہ تو سحر زدہ ہوا ہے، کیونکہ یہ ایک آسیب کے نام

سے باتیں کر رہا ہے۔“ ایک تیسرے شخص نے تبصرہ کیا، ”ہم نے اس طرح بدنامی کی باتیں آج سے پہلے کبھی نہیں سنی ہیں، حتیٰ کہ اپنے باپ داداؤں سے بھی نہیں۔ ہمیں ان باتوں کو ختم کرنا چاہئے۔“ چوتھے شخص نے اپنے قریب ایک شخص کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا، ”جب میں اس کی باتیں سن رہا تھا، میں نے اپنے اندر ایک نیا جذبہ محسوس کیا۔“ اگلے آدمی نے کہا، ”لیکن راہب حضرات کو ہماری ضروریات کا علم اس کے علم سے زیادہ ہے؛ ان پر شبہ کرنا گناہ ہے۔“ جب سمندر کی گرج کی مانند آوازیں ہر طرف سے تیز ہونے لگیں تو ایک راہب آگے بڑھا اور جان کو پکڑ کر اسے فوراً قانون کے حوالے کیا؛ اس کے بعد اس کو مقدمہ چلانے کے لئے گورنر کے محل لے جایا گیا۔

پوچھ تاچھ کے دوران جان نے ایک لفظ بھی نہیں بولا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ عیسیٰؑ مسیح نے اپنے جفاشعاروں کے سامنے خاموشی اختیار کی تھی۔ گورنر نے جان کو ایک قید خانے میں ڈالنے کا حکم دیا، وہاں پر اس نے تہہ خانے کی پتھریلی دیوار سے اپنے سر کو سہارا دے کر سکون اور دلجمعی کے ساتھ سو کر رات گزاری۔

اگلے دن جان کے والد آئے اور انھوں نے گورنر کے حضور میں اقرار کیا کہ ان کا لڑکا پاگل ہے اور انھوں نے دکھ کے ساتھ کہا، ”کئی بار میں نے

اسے خود سے باتیں کرتے ہوئے اور ان عجیب چیزوں کے بارے میں بولتے ہوئے سنا ہے جنہیں نہ تو کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ کئی دفعہ وہ رات کی خاموشی میں بیٹھ کر مبہم الفاظ میں باتیں کرتا تھا۔ میں نے اسے ایک افسوں گر کی طرح بھوتوں کو بلاتے سنا ہے۔ آپ ان پڑوسیوں سے پوچھ سکتے ہیں جنہوں نے اس سے باتیں کیں اور بلا شبہ انہوں نے اس کو پاگل پایا۔ جب کوئی اس سے بولتا تھا تو وہ کبھی جواب نہیں دیتا تھا، اور جب وہ بولتا تھا تو ہمیشہ موضوع سے ہٹ کر اور پراسرار زبان میں باتیں کرتا تھا۔ اس کی ماں اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ کئی بار اس نے اسے چمکتی آنکھوں کے ساتھ دور افق پر نظریں جمائے، ایک بچے کی مانند، جذبات کے عالم میں کتابوں، پھولوں اور ستاروں کے بارے میں بولتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان راہبوں سے پوچھ لیجئے جن کی تعلیمات کا یوم لینٹ میں اس نے تضحیک کیا اور تنقید کی۔ وہ پاگل ہے، عزت ماب جناب! لیکن وہ میرے اور اپنی ماں کے تئیں بہت رحمدل ہے۔ ہمارے بڑھاپے میں ہماری مدد کرنے کے لئے وہ بہت کچھ کرتا ہے۔ اور ہمیں کھلانے پلانے، گرم اور زندہ رکھنے کی خاطر وہ بہت جانفشانی سے کام کرتا ہے۔ اس پر ترس کھائیے اور ہم پر رحم کیجئے!“

گورنر نے جان کو آزاد کر دیا، اور اس کی دیوانگی کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ پھر جب لوگ جان کے بارے میں باتیں کرتے، تو اس کے نام

کو طنز اور بے عزتی کے ساتھ لیتے، اور کنواری لڑکیاں اسے دکھی آنکھوں سے دیکھا کرتیں اور کہتیں، ”عالم بالا کا اس آدمی میں ایک عجیب مقصد ہے... خدا نے اس کی جوانی میں خوبصورتی اور جنون کو یکجا کر دیا اور اس کی آنکھوں کی رحمانہ چمک کو اس کی ان دیکھی ذات کی تاریکی سے جوڑ دیا ہے۔“

خدا کے کھیتوں اور گھاس کے میدانوں کے نیچ، اور ہری گھاس اور خوبصورت پھولوں کی چادر اوڑھے ٹیلوں کے کنارے، تنہا اور بے چین جان کا بھوت سیلوں کو، سکون کے ساتھ اور آدمیوں کے مصائب سے بے خلل، چرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اشک بھری آنکھوں سے وہ وادی کے دونوں طرف بکھرے ہوئے گاؤں کو دیکھ کر گہری آہوں کے ساتھ دوبارہ کہتا ہے، ”تم تعداد میں کئی ہو جبکہ میں تنہا ہوں—تم جو چاہو میرے ساتھ کر سکتے ہو؛ بھیرے میمنہ کا رات کی تاریکی میں شکار کرتے ہیں؛ لیکن وادی کے پتھروں پر خون کے دھبے رہ جاتے ہیں؛ اور جب سحر ہوتی ہے تو سورج اپنی کرنوں کو بکھیر کر اس جرم کو سب پر عیاں کر دیتا ہے۔“

فسون کار حور

اے فسوں کار حور! تم مجھے کہاں لئے جا رہی ہو؟
کانٹے اگائی ہوئی اس خاردار سڑک پر
میں کب تک تمہارے پیچھے پیچھے چلوں؟
ہماری روحیں تکلیف کے ساتھ کب تک
اس بل کھاتی ہوئی، چٹانوں کی راہ پر
نشیب و فراز ہا سے گزریں گی؟

اپنی ماں کے تعاقب کرنے والے
ایک بچے کی مانند
دوپٹے کا کونہ پکڑے
میں تمہاری اتباع کر رہا ہوں،
اپنے خواب بھلا کر میں
تمہارے حسن کو تکتا ہوں،
تمہارے فسوں کے زیر اثر
میں اپنے اوپر منڈلا رہے بھوتوں کے ہجوم سے

چشم پوشی کر رہا ہوں
اور اپنے اندر موجود ناقابل انکار
باطنی قوت کے ذریعہ میں
تمہاری جانب کھنچا ہوا ہوں۔

رک جاؤ، دم بھر کے لیے رک جاؤ!
اور مجھے اپنے رخسار کا دیدار کرنے دو؛
اور ایک لمحے کے لئے میری جانب نظرِ کرم کرو؛
شاید میں تمہاری نرالی آنکھوں سے
تمہارے دل کے بھید جان لوں۔
رک جاؤ! اور تھوڑا آرام کرو،
کیونکہ میں تھک گیا ہوں، اور میری روح
اس بیستناک پگڈنڈی پر لرزہ بر اندام ہے۔
رکو، کیونکہ ہم اس وحشت ناک چوراہے پر پہنچ گئے ہیں جہاں
موت زندگی سے گلے ملتی ہے۔

اے حور! میری بات سنو!
 میں آزاد تھا، پرندوں کی طرح
 میں وادیوں اور جنگلوں میں مجھ کاوش تھا
 اور وسیع آسمان میں مجھ پرواز تھا۔
 شام کے وقت درختوں کی شاخوں پر آرام کرتا تھا،
 جنہیں سورج صبح کے وقت تعمیر کرتا ہے
 اور شام سے پہلے ہی منہدم کر دیتا ہے،
 ان رنگ برنگے بادلوں سے بنے ہوئے
 شہر کی عبادت گاہوں اور محلوں کے بارے میں غور و فکر کرتا تھا۔

میں ایک خیال کی مانند تھا،
 اس کائنات کے شرق و غرب میں سکون کے ساتھ چلتا پھرتا،
 زندگی کی خوبصورتی اور خوشی سے لطف اندوز ہوتا
 اور وجود کے عظیم الشان راز کو دریافت کرتا تھا۔

اک خواب سا تھا میں، جو رات کے رفیق پنکھ کے
 سائے میں چوری سے نکلتا

اور بند کھڑکیوں سے ہو کر
دو شیزاؤں کے کمروں میں داخل ہوتا ہے،
دل لگی کرتا ہے اور ان کی امیدوں کو بیدار کرتا ہے....
پھر میں نوجوانوں کے پاس بیٹھا اور ان کی
خواہشات میں اضطراب پیدا کیا...
اس کے بعد میں نے بڑوں کے مقاموں کی کاوش کی
اور ان کی پرسکون قناعت کے خیالات میں سرایت کی۔

پھر میرے خیال پر تم قابض ہو گئیں
اور اس تنویکی لمحے سے میں خود کو
ایک ایسا قیدی سا محسوس کرتا ہوں
جو اپنی بیڑیاں زمین پر گھسیٹ رہا ہو
اور کسی نا معلوم جگہ لے جایا جا رہا ہو...
میں تمہاری میٹھی شراب سے خمخور ہوا
جس نے مجھ سے میرا ارادہ چرا لیا
اور اب میں اپنے ہونٹوں کو
اسی ہاتھ کو چومتے پا رہا ہوں

جو مجھے زور زور سے تھپڑ رسید کر رہا ہے۔

میرا دل کچلا جا رہا ہے: کیا تم یہ
اپنی روح کی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتی؟

دم بھر کے لیے رک جاؤ!

میں اپنا دم سنبھال رہا ہوں

میں اپنی قوت بحال کر رہا ہوں

اور میں اپنے خستہ پاؤں

بھاری زنجیروں سے آزاد کر رہا ہوں۔

میں نے اس پیالی کو کچل دیا ہے جس سے

میں نے تمہارا لذیذ زہر پیا ہے... لیکن

اب میں ایک عجیب مقام میں ہوں؛ اور

حیرت زدہ ہوں کہ کس راہ پر چلوں؟

میری آزادی مجھے واپس حاصل ہو گئی ہے؛

کیا اب تم مجھے

ایک رضامند ساتھی کی حیثیت سے قبول کرو گی،

جو چمکتی آنکھوں سے سورج کو دیکھتا ہے
اور آگ کو ناآشنائے لرزش انگلیوں سے سما لیتا ہے؟

میں نے اپنے پروں کو کھول دیا ہے اور
اب میں بلندی میں اڑان بھرنے کو تیار ہوں؛
کیا تم ایک ایسے نوجوان کے ساتھ چلو گی
جو ایک تنہا عقاب کی مانند
اپنے ایام پہاڑوں میں گھومتے ہوئے گزار دیتا ہے
اور ایک بے قرار شیر کے مثل
صحرا نوردی کرتے ہوئے اپنی راتیں برباد کرتا ہے؟

کیا تم خود کو کسی ایسے شخص کی الفت سے مطمئن کرو گی
جو محبت کو صرف راحت مانتا ہے اور اسے اپنا آقا
تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے؟

کیا تم وہ ایک دل قبول کرو گی
جو محبت کرتا ہے مگر زیر نہیں ہوتا ہے؟

جو جلتا ہے مگر گچھلتا نہیں؟
 کیا تم اس ایک روح کے ساتھ سہل اندازی سے
 رہو گی، جو طوفان کے سامنے کانپتی تو ہے لیکن
 کبھی خود کو اس کے حوالہ نہیں کرتی؟ کیا تم ایک ایسے آدمی کو
 اپنا ساتھی تسلیم کرو گی
 جو کسی کو غلام نہیں بناتا ہے
 نہ ہی وہ خود کوئی غلام بن سکتا ہے؟
 کیا تم مجھے اپنا بناؤ گی
 لیکن میرے دل کو ایک طرف چھوڑ میرا جسم
 اپنی زد میں رکھتے ہوئے مجھے اپنی ملکیت کی چیز نہ بنا کر؟

اگر ایسا ہے تو

یہ رہا میرا ہاتھ— اسے اپنے خوبصورت ہاتھ سے
 پکڑ لو؛ اور یہ ہے میرا جسم— اسے اپنی محبت بھری باہوں میں جکڑ لو؛
 اور یہ ہیں میرے ہونٹ— ان پر ایک گہرا اور مدہوش کرنے والا بوسہ ثبت
 کر دو۔

پس پردہ

راخل آدھی رات کو بیدار ہوئی اور اپنے حجرے کے فلک میں کسی غیر مرئی چیز کو تکتے لگی۔ اس نے ایک آواز سنی جو زندگی کی سرگوشی سے زیادہ تسلی بخش، پاتال کی کراہتی آواز سے زیادہ غمگین، سفید پروں کی پھر پھراہٹ سے زیادہ سریلی، اور لہروں کے پیغام سے زیادہ گہری تھی... وہ آواز امید و عبثیت، شادمانی و بدحالی اور زندگی کی الفت کے ہوتے ہوئے بھی موت کی تمنا کے ساتھ بازگشت کرتی رہی تھی۔ تب راخل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور گہری آہ بھر کر ہانپتے ہوئے یہ کہنے لگی، ”صبح وادی کے اس پار تک پہنچ گئی ہے؛ ہمیں سورج کی طرف جانا چاہئے اور اس سے ملاقات کرنی چاہئے۔“ اس کے ہونٹ جدا تھے، جو روح میں لگے ایک گہرے زخم جیسے تھے اور اسی کی گونج پیدا کر رہے تھے۔

اور اسی لمحے پادری صاحب اس کے بستر کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ کو چھوا۔ اس نے راخل کے ہاتھ کو برف کی مانند ٹھنڈا پایا؛ اور جب اس نے اداسی سے اس کے دل پر اپنی انگلیاں رکھیں تو اسے پورا یقین ہو گیا کہ یہ تو زمانوں ہی کی طرح غیر متحرک تھا اور اس کے اپنے دل کے راز ہی کی مانند خاموش تھا۔

معظم پادری نے انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنا سر جھکا یا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے، مانو کہ وہ کوئی الہامی لفظ ادا کرنے کا مشتاق ہو، جس الہامی لفظ کو دور دراز کی غیر آباد وادیوں میں رات کے بھوت دہراتے ہیں۔

راخل کے بازوؤں کو اس کی چھاتی پر رکھنے کے بعد پادری نے اس کمرے کے ایک تاریک کونے میں بیٹھے ایک آدمی پر نظر ڈالی اور ہمدردی و رحم سے پر آواز میں کہا، ”تمہاری پیاری بیوی روشنی کے عظیم دائرے میں پہنچ گئی ہے، آؤ میرے بھائی، ہم جھک کر دعا کریں۔“

غمگین شوہر نے اپنا سر اٹھایا؛ اس کی خالی آنکھیں نظر نہ آنے والی چیز کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں، اور تب اس کا تاثر تبدیل ہو گیا، گویا کہ اس نے ایک نامعلوم خدا کی روح میں ادراک حاصل کیا ہو۔

اس نے اپنے بچے کھچے خود کو مجتمع کیا، اور وہ با ادب ہو کر اپنی بیوی کے بستر کی جانب آیا۔ پھر وہ پادری کی بغل میں بیٹھ کر جھک گیا۔ اس وقت پادری دعا میں مشغول تھا، ماتم کر رہا تھا اور صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔

دکھ کے مارے شوہر کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر پادری نے دھیرے سے کہا، ”بغل والے کمرے میں جاؤ، بھائی، کیونکہ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔“

وہ ایک فرماں بردار کی طرح اٹھ کر کمرے میں چلا گیا اور وہاں اس نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو ایک تنگ بستر پر ڈھا دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ نیند کی دنیا میں ایسے تیر رہا تھا جیسے کہ ایک ننھا منا بچہ اپنی محبوب ماں کی باہوں میں پناہ لیتا ہے۔

پادری کمرے کے بچوں نیچ ایک بت کی مانند کھڑا رہا، اور وہ ایک عجیب و غریب کشمکش کی زد میں پڑا۔ اس نے نم آنکھوں سے پہلے نوجوان عورت کے ٹھنڈے پڑے جسم کو اور پھر پردے کی دراڑ سے اس کے شوہر کو دیکھا جس نے خود کو نیند کے لہاوے کے حوالہ کر دیا تھا۔ ایک زمانے سے بھی زیادہ دراز اور موت سے زیادہ وحشت ناک ایک گھنٹہ پہلے ہی گزر چکا تھا، اور پادری اب بھی دو جدا ہو چکی روحوں کے درمیان کھڑا تھا۔ ایک روح ایسے خواب دیکھ رہی تھی جیسے کہ ایک کھیت موسم سرما کے المیہ کے بعد آنے والے موسم بہار کے سنے سجاتا ہے اور دوسری ہمیشہ کے لئے آرام کر رہی تھی۔

پھر پادری نوجوان عورت کے قریب آیا اور ایسے جھک گیا گویا کہ جائے نیاز کے سامنے عبادت کر رہا ہو؛ اس نے راخل کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کانپتے ہونٹوں سے لگا لیا، تب اس کے چہرے کو دیکھا جو موت کے نرم و ملائم پردے سے مزین تھا۔ اس وقت پادری کی آواز بہ یک وقت رات کی

مانند پر سکون، خلیج کی مانند گہری اور آدمی کی امیدوں کی مانند لڑکھڑاتی ہوئی تھی۔ اور وہ بہ آواز رونے لگا، ”اے راخل، میری روح کی دلہن، مجھے سنو! بالاخر میں بات کر سکتا ہوں! موت نے میرے لب کھول دئے ہیں تاکہ میں اب تم پر وہ راز آشکارا کر دوں جو خود زندگی سے بھی گہرا ہے۔ درد نے میری زبان کھول دی ہے اور میں تم سے اپنا وہ دکھ بیان کر سکتا ہوں جو درد سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ زمین اور فلک کے درمیان منڈلا رہی اے پاک روح، میری روح کی آواز کو سنو۔ اس نوجوان کی آواز سنو جو تمہارے کھیت سے آنے کا انتظار کرتا تھا، اور تمہارے حسن کے خوف سے تمہیں درختوں کی اوٹ سے گھورا کرتا تھا۔ خدا کی خدمت میں مشغول اس پادری کی آواز سنو جو بے باکی سے تمہیں پکار رہا ہے، جب تم خدا کے شہر پہنچ چکی ہو۔ میں نے اپنی محبت کو چھپا کر اس کی طاقت کو ثابت کر دیا ہے۔“

اس طرح اپنی روح کو کھولنے کے بعد پادری نے جھک کر راخل کی پیشانی، آنکھوں اور گلے پر تین لمبے، گرم اور خاموش بوسے دیئے، جن کے ذریعے اس نے اپنے دل میں بسنے والی محبت و درد اور سال ہا کا عذاب برسایا۔ پھر وہ اچانک ایک تازک کونے میں گیا اور موسم خزاں کی ایک پتی کی مانند ہلتے ہوئے فرش پر غم سے نڈھال ہو کر گر گیا، گویا کہ راخل کے ٹھنڈے چہرے کی مس نے اس کے اندر توبہ کی روح کو بیدار کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس

نے خود کو مجتمع کیا اور جھک گیا، اپنے چہرے کو نیم گول ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے اس نے دھیمنے سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا، ”اے خدا، میرے گناہ کو معاف کر؛ میری کمزوری کو درگزر کر! اے خدا، میں اس چیز کو مزید پوشیدہ نہیں رکھ سکا جس کو تو جانتا تھا، سات سالوں تک میں نے گہرے رازوں کو اپنے دل میں چھپا کر رکھا اور ان کو کسی پر ظاہر نہیں کیا، جب تک کہ موت آگئی اور اس نے ان رازوں کو مجھ سے پھاڑ کر نکالا۔ اے خدا، اس خوفناک اور خوبصورت یاد کو چھپانے میں میری مدد کر، جو زندگی سے میٹھاپن اور تم سے تلخی لاتی ہے۔ میرے خدا، مجھے معاف کر اور میری کمزوری کو درگزر کر۔“

نوجوان عورت کی لاش کو دیکھتے بغیر وہ صبح ہونے تک اس صورتِ حال سے جو جھٹتا اور ماتم کرتا رہا۔ جب صبح ہوئی تو اس نے ان دونوں خاموش تصویروں پر ایک گلابی چادر ڈال دی، اور ایک آدمی میں محبت اور مذہب کے تضادم کو ظاہر کیا؛ اور دوسرے میں زندگی اور موت کے سکون کو۔

مر گئے میرے لوگ

(جلا وطنی میں لکھی گئی نظم جبکہ شام میں قحط پڑا ہوا تھا)

جنگ عظیم اول

میرے لوگ چلے گئے، لیکن میں ابھی بھی موجود ہوں،

اپنی تنہائی میں ان کا ماتم کر رہا ہوں....

میرے دوست مر چکے ہیں، اور ان کی موت سے

میری زندگی کچھ نہیں

محض ایک بھیانک حادثہ ہے۔

میرے وطن کے ٹیلے

آنسوؤں اور خون میں ڈوبے ہوئے ہیں،

کیونکہ میرے لوگ اور میرے احباب گزر گئے

اور میں یہاں

ویسے ہی جی رہا ہوں جیسے تب جیتا تھا

جب میرے احباب زندگی اور زندگی کی فیض و کرم سے

لطف اندوز ہوتے تھے

اور جب میرے وطن کی پہاڑیاں سورج کے نور سے
فیض یاب و محیط تھیں۔

میرے لوگ بھوک سے لقمہ اجل ہو گئے،
اور جو فاقہ کشی سے ہلاک نہیں ہوئے انہیں
تلواروں سے ذبح کر دیا گیا؛
اور میں یہاں دُور دراز مقام پر
نرم بستروں پر سونے والے
خوش و خرم لوگوں کے بیچ گھوم پھر رہا ہوں،
جہاں لوگ دنوں پر مسکراتے ہیں اور دن
ان پر مسکراتے ہیں۔

میرے لوگ ایک دردناک اور شرم ناک موت مرے،
اور یہاں میں اِفراط اور سکون کے ساتھ جی رہا ہوں....
یہ ایک سنگین ترین المیہ ہے
جو میرے دل کے اسٹیج پر ہمیشہ واقع ہو رہا ہے؛
چند ہی ایسے لوگ ہیں جو

یہ ڈرامہ دیکھنا چاہتے ہیں،
کیونکہ میرے لوگ ویسے پرندے ہیں
جن کے شہپر ٹوٹ چکے ہیں، اور جو جھنڈ سے
پتچھے رہ گئے ہیں۔

اگر میں فاقہ زدہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھوک کی مار سہتا،
اور مجھے میرے مظلوم ہموطنوں کے ساتھ تکلیف دی جاتی،
تو میرے پریشان خوابوں پر سیاہ ایام کا بوجھ ہلکا ہوتا
اور میری کھوکھلی آنکھوں، روتے ہوئے دل اور زخم خوردہ روح
کے سامنے رات کی تاریکی کم ہو جاتی،
کیونکہ اپنی عوام کے رنج و الم کو بانٹنے والا شخص
وہ اعلیٰ ترین راحت محسوس کرتا ہے
جو قربانی کے تکلیف سے ہی نمودار ہوتا ہے۔
اور ایسا شخص اپنے آپ سے مطمئن ہوتا ہے
جب وہ اپنے معصوم ساتھیوں کے ہمراہ
بحیثیتِ معصوم وفات پاتا ہے۔

لیکن موت کے جلوس میں شہادت کی جانب گامزن
 اپنے بھوکے اور مصیبت کے مارے لوگوں کے درمیان
 میں زندگی نہیں گزار رہا ہوں....
 میں یہاں، وسیع و عریض سمندروں کے پار،
 اطمینان کی چھاؤں اور امن و امان کی
 دھوپ میں جی رہا ہوں....
 میں حالِ زار سے لبریز اکھاڑے
 اور مصیبت زدہ لوگوں سے نہایت دور ہوں
 اور مجھے کسی چیز پر فخر نہیں ہے، میرے اپنے آنسوؤں پر بھی نہیں۔
 اپنے فاقہ زدہ لوگوں کے لئے ایک جلا وطن کیا ہوا بیٹا کیا کر سکتا ہے؟
 اور ایک غیر حاضر شاعر کی آہ و زاری ان کے لیے کس کام کی ہو سکتی
 ہے؟

کاش کہ میں اپنے وطن کے کھیت میں اگنے والی
 مکئی کی ایک بالی ہوتا، تو کوئی بھوکا بچہ مجھے توڑ کر
 میرے دانوں کے ذریعہ اپنی روح سے موت کے
 ہاتھ کو ہٹا سکتا۔ کاش ایسا ہوتا کہ میں

اپنے وطن کے باغیچے میں
 ایک پکا ہوا پھل ہو جاتا اور بھوکی عورتیں مجھے اکٹھا کر کے
 زندگی قائم رکھتیں۔ اے کاش کہ میں
 اپنے وطن کی فضا میں
 اڑنے والا ایک طائر ہوتا
 کہ میرا بھوکا بھائی مجھے شکار کر کے
 میرے جسم کے گوشت کو کھا کر
 اپنے جسم سے قبر کے سائے کو دور کرتا۔
 لیکن افسوس! میں شام کے کھیتوں میں
 اگائی ہوئی کوئی مکئی کی بالی نہیں ہوں،
 نہ ہی لبنان کی وادیوں میں کوئی پکا ہوا میوہ ہوں؛
 یہ میری آفت ہے اور یہ میرا پرسکوت المیہ ہے
 جو میری روح کو ذلت سے ہمکنار کرتا ہے
 اور رات کے جنوں کے سامنے شرمسار کرتا ہے....
 یہ وہ دردناک سانحہ ہے جو میری زبان کو بند کرتا ہے،
 میرے بازوؤں کو باندھ دیتا ہے اور مجھے قیدی بنا لیتا ہے،
 یہ مجھ سے میری طاقت، میری مرضی

اور میری قوتِ عمل چھین لیتا ہے۔
یہ خدا اور انسان کے رو بہ رو میری پیشانی پر
آگ سے داغی ہوئی
ایک لعنت ہے۔

لوگ اکثر مجھ سے کہتے ہیں،
”تمہارے وطن کی آفت پوری دنیا کی آفت کے مقابلہ میں
کچھ بھی نہیں ہے، اور تمہارے لوگوں کے بہائے ہوئے خون کے آنسو
زمین کے میدانوں اور وادیوں میں بہنے والی خون اور آنسو
کی ندیوں کے مقابلہ میں ہچ ہیں...“

ہاں، لیکن میرے لوگوں کی موت
ایک خاموش تہمت ہے؛
یہ غیر مرئی سانپوں کے پھنوں کے ذریعہ ارتکاب کردہ جرم ہے...
یہ ایک بے نغمہ اور بے منظر المیہ ہے....

اگر میرے لوگوں نے مطلق العنان حکمرانوں اور ظالموں پر حملہ کیا ہوتا

اور ان کی موت باغیوں کی حیثیت میں ہوئی ہوتی
 تو میں کہتا، ”آزادی کی خاطر مر جانا
 کمزور اطاعت کے سائے میں حسنے سے بہتر ہے، کیونکہ
 اپنے ہاتھوں میں سچائی کی تلوار لے کر موت کو گلے لگانے والا شخص
 سچائی کی ابدیت کے ساتھ ابد نشین ہو جاتا ہے،
 چنانچہ زندگی موت کے مقابلہ میں کمزور
 اور موت سچائی کی بنسبت کم طاقتور ہے۔“

اگر میری قوم نے
 تمام قوموں کی جنگ میں حصہ لیا ہوتا
 اور اس کی موت میدانِ جنگ میں ہوئی ہوتی
 میں کہتا کہ غضبناک طوفان نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر
 ہری بھری ٹہنیوں کو توڑ ڈالا ہے؛ اور طوفان کے سائبان تلے
 واقع ہونے والی بہادر کی موت
 ضعیفی کے بازوؤں میں آہستہ آہستہ آنے والی مرگ سے اشرف ہے۔
 لکن بند ہوتے جبروں سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی... میرے لوگ
 گر پڑے اور بلکتے فرشتوں کے ساتھ رونے لگے۔

اگر کسی زلزلے نے میرے ملک کو
تہ و بالا کر دیا ہوتا اور زمین نے میرے لوگوں کو
اپنے سینے میں جذب کیا ہوتا؛
تو میں کہتا، ”خدائی طاقت کی مرضی سے
ایک عظیم اور پر اسرار قانون حرکت میں آ گیا ہے،
اور یہ خالص پاگل پن ہوگا اگر ہم
کمزور اور فانی لوگ،
اس کے گہرے رازوں کو جاننے کی کوشش کریں... ”

لیکن میرے لوگ باغیوں کی حیثیت میں نہیں مرے؛
وہ جنگ کے میدان میں نہیں مارے گئے؛
نہ ہی کسی زلزلے نے میرے ملک کو تباہ و برباد کیا اور میرے لوگوں کو
زیر کیا۔

موت ان کی واحد نجات تھی،
اور فاقہ کشی ان کا واحد حاصل۔

میرے لوگ صلیب پر مرے...
وہ فوت ہوئے، جب ان کے ہاتھ شرق و غرب کی جانب
دراز تھے،
جبکہ ان کی آنکھوں کے بچے کھجے حصے
فلک کی تاریکی کو ٹکٹی باندھے دیکھ رہے تھے...
وہ چپ چاپ مر گئے،
کیونکہ انسانیت نے ان کی چیخ و پکار پر اپنے کان بند کر رکھے تھے۔
وہ لقمہ اجل ہوئے کیونکہ
انہوں نے اپنے دشمن کو دوست نہیں بنایا۔
وہ مر گئے کیونکہ وہ اپنے پڑوسیوں سے محبت کرتے تھے۔
وہ مر گئے کیونکہ انہوں نے
پوری انسانیت پر بھروسہ کیا تھا۔
وہ مر گئے کیونکہ انہوں نے ظالموں پر ظلم نہیں کیا۔
وہ مر گئے کیونکہ وہ کچلے ہوئے پھول تھے
اور وہ روندنے والے پیر نہیں تھے۔
وہ مر گئے کیونکہ وہ امن پناہ کرنے والے تھے۔
وہ ایک ایسی سر زمین میں بھوک سے ہلاک ہو گئے

جہاں دودھ اور شہد بکثرت پائے جاتے ہیں۔
 وہ مر گئے کیونکہ جہنم کے عفریت ہا اٹھے اور
 ان کے کھیتوں کی تمام فصل کو برباد کر دیا اور
 ان کے مرتبانوں سے ان کے آخری اجناس ہڑپ لیے...
 وہ مر گئے کیونکہ افعی ہا اور ان کے فرزندوں نے
 فضا میں زہر کی پچکاری چھوڑی
 جس فضا میں مقدس صنوبر کے درخت، گلاب اور یاسمین اپنی خوشبوئیں
 بکھیرتی ہیں۔

میرے لوگ اور تمہارے لوگ،
 میرے شامی بھائی، مر چکے ہیں... ان کے لیے
 کیا کیا جا سکتا ہے جو
 مر رہے ہیں؟
 ہمارے ماتم سے ان کی بھوک کو تسکین نہیں ہو گی،
 اور ہمارے آنسو
 ان کی پیاس نہیں بجھائیں گے؛
 ہم ان کو بھوک کے آہنی جڑوں سے بچانے کی خاطر

کیا کر سکتے ہیں؟
 میرے بھائی! رحمدلی، جو تمہیں
 زندگی گنوانے کے سایے میں پڑے کسی شخص کو
 اپنی زندگی کا ایک حصہ دینے پر مجبور کرتی ہے
 وہ واحد حسنِ اخلاق ہے جو تمہیں
 دن کے نور اور رات کے سکون کا مستحق بناتا ہے...
 یاد رکھو، میرے بھائی! وہ سکہ جسے تم اپنی جانب دراز
 مرجھائے ہوئے ہاتھ میں ڈال دیتے ہو
 وہ سنہری زنجیر ہے جو تمہارے دولت مند دل کو
 خدا کے شفقت بھرے دل سے جوڑ دیتی ہے....

حوصلہ مند گلِ بنفشی

ایک خوبصورت اور خوشبودار گلِ بنفشی، ایک گوشہ نشین چمن زار میں اپنی ہجولیوں کے ساتھ شرافت کے ساتھ رہتی اور دوسرے پھولوں کے ساتھ خوشی سے جھومتی تھی۔ ایک صبح، جب اس کے تاج پر شبنم کے موتی جڑے ہوئے تھے، اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا؛ تو اسے ایک اونچی اور خوبصورت پھولِ گلابی نظر آئی جو ایک زمردی رنگ کی قندیل پر لگی ایک روشن شمع کی مانند فخر کے ساتھ کھڑی فضا میں دور تک بلند تھی۔

گلِ بنفشی نے اپنے نیلے ہونٹ کھولے، اور کہا، ”ان گلوں کے مابین میں کتنی بد قسمت ہوں، اور ان میں میری حیثیت کتنی کم ہے! فطرت نے مجھے قد میں چھوٹی، اور بیچارگی کی زندگی گزارنے کے لئے بنایا ہے.... میں زمین سے بہت قریب رہتی ہوں، اور جس طرح سے پھولِ گلابی آسمان کی طرف اپنے سر کو بلند اور سورج کی جانب اپنا رخ کر سکتی ہے، میں ویسا نہیں کر سکتی۔“

پھولِ گلابی نے اپنی پڑوسن کی بات سنی؛ تو وہ ہنس پڑی اور تبصرہ کرنے لگی، ”تمہاری بات کتنی عجیب ہے! تم خوش قسمت ہو، لیکن تمہیں اپنی خوش قسمتی کا ادراک نہیں ہے۔ فطرت نے تم کو وہ خوشبو اور خوبصورتی عطا کی ہے جو کسی اور کے حصے میں نہیں آئی... اس طرح کے خیالات ترک کر دو اور

اپنی حالت پر قناعت کرو، اور یاد رکھو کہ تواضع اختیار کرنے والا سرفراز ہو جاتا ہے، اور خود پسندی میں مبتلا شخص ذلیل و خوار ہوتا ہے۔“

گلِ بنفشی نے جواب دیا، ”تم مجھے اس ناطے تسلی دے رہی ہوں کیونکہ تمہیں وہ پہلے ہی حاصل ہے جس کی میں آرزو مند ہوں... تم اپنے عظیم ہونے کا ضمنی مفہوم جتلا کر میرے اندر تلخی پیدا کر رہی ہو... بد حال شخص کے دل کو خوشحال شخص کا درس دینا کتنی دردناک بات ہے! اور طاقتور کتنا سنگدل ہوتا ہے جب وہ کمزور لوگوں میں صلاح کار کا کام کرنے لگتا ہے!“

اور فطرت نے گلِ بنفشی اور پھولِ گلابی کی گفتگو سنی؛ وہ آئی اور بولی، ”تمہیں کیا ہو گیا ہے، میری بیٹی گلِ بنفشی؟ تم اپنے تمام اعمال اور اقوال میں متواضع اور شیریں تھی۔ کیا حرص نے تمہارے دل میں جگہ کر کے تمہارے حواس کو شل کر دیا ہے؟“ ایک ملتجیانہ آواز میں بنفشی نے اس کو یہ کہہ کر جواب دیا، ”محبت اور ہمدردی کے جذبات سے پُر اے عظیم اور رحمدل امی جان! میں تم سے دل اور روح کی گہرائیوں سے درخواست کرتی ہوں کہ تم میری درخواست کو منظور کر کے مجھے ایک دن کے لئے پھولِ گلابی بنا دو۔“

اور فطرت نے جواباً کہا، ”تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تم کس چیز کی طلبگار ہو؛ تم اپنی اندھی امنگ کے پس پردہ مخفی قیامت سے بے خبر ہو۔ اگر تم پھولِ گلابی ہوتی تو تمہیں افسوس ہوتا، اور پچھتاوے سے تمہیں کچھ بھی حاصل

نہیں ہوتا۔“ بنفشی نے اصرار کیا، ”مجھے ایک لمبی پھولِ گلابی میں تبدیل کر دو، کیونکہ میں اپنے سر کو فخر کے ساتھ بلند کرنا چاہتی ہوں؛ اور میری قسمت میں جو بھی ہو، وہ میری اپنی کرنی ہوگی۔“

فطرت نے اس کی بات مان لی، اور کہا، ”اے جاہل اور باغی بنفشی، میں تمہاری درخواست پوری کئے دیتی ہوں۔ لیکن اگر تم پر کوئی آفت آئے گی تو شکایت اپنے آپ سے کرنا۔“

تب فطرت نے اپنی پراسرار اور ساحری انگلیاں پھیلا کر بنفشی کی جڑوں کو چھوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک اونچی پھولِ گلابی کے پودے میں تبدیل ہو کر باغیچے کے تمام پھولوں سے بلند ہو گئی۔

شام کے وقت آسمان پر گھنے بادل چھا گئے، اور غضبناک عناصر نے گرج کے ساتھ وجود کی خاموشی کو توڑ دیا، اور طوفانی بارش اور زبردست آندھی کو بھیج کر انہوں نے باغیچے پر حملہ شروع کیا۔ طوفان نے سٹنیوں کو پھاڑ ڈالا، پودوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور لمبے پھولوں کے تنوں کو توڑ دیا؛ صرف مہربان زمین کے قریب گزر بسر کرنے والے پھول ہی باقی بچے۔ گوشہ نشین باغ کو جنگ پر آمادہ آسمانوں سے بھاری نقصان ہوا، اور جب طوفان تھم گیا اور مطلع صاف ہوا تو تمام پھول برباد ہو کر پڑے تھے اور باغیچے کی دیوار کی آڑ میں موجود چھوٹی چھوٹی گل بنفشی کے قبیلے کے سوا کوئی بھی پھول

فطرت کے اس قہر سے محفوظ نہیں رہا تھا۔

اپنا سر اٹھانے اور پھولوں اور درختوں کا المیہ دیکھنے کے بعد ایک دو شیزہ
بنفشی خوشی سے مسکرائی، اور اس نے اپنے ساتھیوں کو پکارا، اور کہا، ”آؤ،
دیکھو کہ مغرور پھولوں کے ساتھ طوفان نے کیسا برتاؤ کیا ہے!“ ”ایک دوسری
بنفشی نے کہا، ”ہم چھوٹی ہیں اور زمین کے قریب رہتی ہیں، مگر ہم آسمان
کے غضب سے محفوظ ہیں۔“ ایک تیسری نے کہا، ”چونکہ ہماری اونچائی زیادہ
نہیں ہے، اس لئے طوفان ہمیں مغلوب نہیں کر سکا۔“

اور اسی لمحے بنفشی رانی کی نظر اپنی بغل میں تبدیل ہو کر پھولِ گلابی بنی
گلِ بنفشی پر پڑی، جسے طوفان نے زمین پر دے مارا تھا اور جو میدانِ جنگ
میں، ٹانگوں کی صحت سے محروم ہوئے، کسی سپاہی کی مانند بھگی گھاس پر مسخ
صورت ہو کر پڑی تھی۔ بنفشی رانی نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے قبیلے والوں کو
پکارا، اور کہا، ”میری بیٹیو، دیکھو، اور غور کرو کہ حرص نے اس بنفشی کے
ساتھ کیا کیا ہے جو ایک گھنٹہ کے لئے ایک متکبر پھولِ گلابی بن گئی تھی۔
اس منظر کی یاد کو اپنی بھلی تقدیر میں یقین کا سبب بنا لو۔“

تب قریب المرگ پھولِ گلابی متحرک ہوئی اور اس نے اپنی باقی ماندہ قوت
کو مجتمع کر کے دھیمی آواز میں کہا، ”تم قناعت پسند اور منکسر المزاج کند
ذہن ہو؛ مجھے کبھی طوفان کا خوف نہیں تھا۔ کل میں بھی اپنی زندگی سے

مطمئن اور اس پر قانع تھی، لیکن یہ قناعت پسندی میرے وجود اور زندگی کے طوفان کے درمیان حائل تھی، جس نے مجھے ایک مریضانہ اور کاہلانہ چین اور ذہنی سکون کے حصار میں قید رکھا تھا۔ میں بھی تمہاری ہی طرح خوف کے مارے زمین سے چمٹ کر اسی طرح زندگی گزار سکتی تھی جیسا کہ تم سب ابھی جی رہی ہو... میں بھی موسم سرما کا انتظار کر سکتی تھی کہ وہ آ کر مجھے برف کا کفن پہنا دے اور مجھے موت کے ہاتھ میں سوئپ دے، جیسا کہ ہر بنفشی کے ساتھ لازماً ہونا ہے... میں اب خوش ہوں کیونکہ میں نے اپنی چھوٹی سی دنیا سے باہر جا کر کائنات کے راز کا مشاہدہ کیا ہے، جو ایک ایسی چیز ہے جسے تم سب نے ابھی تک نہیں کیا ہے۔ میں بھی حرص کو نظر انداز کر سکتی تھی، جس کی فطرت مجھ سے بالاتر ہے، لیکن جب میں نے رات کی خاموشی پر کان دھرا تو میں نے آسمانی سلطنت کو زمینی سلطنت سے یہ بات کرتے سنا، ”وجود سے پرے کا ہدف رکھنا ہمارے وجود کا ایک ضروری مقصد ہے۔“ اسی لمحے میری روح نے بغاوت کی اور میرے دل میں اپنے محدود وجود سے فائق مقام کی چاہت پیدا ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ تحت الثری ستاروں کے گیتوں کو نہیں سن سکتا، اور اسی لمحے میں نے اپنے چھوٹے پن سے لڑائی شروع کر دی اور اس کی تمنا کرنے لگی جو میرا نہ تھا، جب تک کہ میرا جذبہ بغاوت ایک عظیم طاقت میں نہ بدل گیا اور میری تمنا ایک تخلیق کار ارادے

میں تبدیل ہوگئی... فطرت جو ہمارے گہرے تر خوابوں کی عظیم مدعا ہے، اسی فطرت نے میری درخواست منظور کی اور اپنی ساحری انگلیوں کے ذریعے مجھے ایک پھول گلابی میں بدل دیا۔“

پھول گلابی ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئی، اور فخر اور حصولیابی کی آمیزش والی ایک کمزور ترین ہوتی ہوئی آواز میں کہا، ”میں نے ایک گھنٹہ ایک با مسرت پھول گلابی کی زندگی گزاری ہے؛ میں کچھ وقت تک ایک رانی کی مانند رہی ہوں؛ میں نے پھول گلابی کی آنکھوں سے اس کائنات کو دیکھا ہے؛ پھول گلابی کے کانوں سے فلک کی سرگوشی کو میں نے سنا ہے اور پھول گلابی کی پنکھڑیوں سے نور کے لباس کے پلو کو چھوا ہے میں نے۔ کیا یہاں پر اور کوئی ہے جو اس شرف کا دعویٰ ہے؟“ ایسا بولنے کے بعد اس نے اپنا سر جھکا لیا، اور ایک بند ہو رہی آواز میں ہانپتے ہوئے کہا، ”اب میں مر جاؤں گی کیونکہ میری روح نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ بالآخر میں نے اپنی پیدائش کے تنگ غار سے بالاتر ایک دنیا تک اپنی معلومات کو پھیلا دیا ہے۔ یہ زندگی کا منصوبہ ہے... یہی وجود کا راز ہے۔“ تب گلابی کانپنے لگی؛ اس نے آہستہ آہستہ اپنی پنکھڑیوں کو سکڑ لیا۔

اور ہونٹوں پر آفاقی تبسم لیے اس نے آخری سانس لی... وہ تبسم زندگی
کی امید اور مدعا کی تکمیل کا تبسم تھا... فتح کی مسکراہٹ تھی وہ... خدا کا
تبسم تھا وہ۔

مصلوب

(گڈ فرائیڈے کے موقعہ پر لکھی گئی)

آج، اور ہر سال اسی دن، انسان اپنی گہری نیند سے اچانک بیدار ہوتا ہے اور صلیب پر کیلوں سے ٹھونکنے ہوئے عیسیٰ کو دیکھنے کے لیے، اشکبار آنکھوں سے، کوہِ گول گو تھا کی طرف دیکھتے ہوئے، زمانہ ہا کے عفریتوں کے روبرو کھڑا ہوتا ہے... لیکن جیسے ہی دن اختتام کو پہنچتا ہے اور شام آجاتی ہے، لوگ واپس آ جاتے ہیں اور ہر پہاڑی، ہر سبزہ زار اور گیہوں کی ہر خرید و فروخت میں قائم بتوں کے آگے سجدے کرتے ہیں اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔ آج عیسائی روحیں یادوں کے پروں پر سوار ہو کر یروشلم اڑ جاتیں ہیں۔ وہاں وہ ہجوم میں کھڑی ہو کر سینہ کوبی کریں گئیں اور سر پر کانٹوں کا سہرا پہنے، آسمان کے سامنے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے، اور موت کے پردے کے پیچھے زندگی کی گہرائیاں دیکھتے ہوئے، عیسیٰ مسیح کو تکلئی باندھ کر دیکھیں گیں۔ لیکن جب دن کے اسٹیج پر رات کا پردہ گر جائے گا اور مختصر سا ڈرامہ ختم ہو جائے گا، عیسائی لوگ جماعت در جماعت واپس ہوں گے اور فراموشی کی چھاؤں میں جہالت و سستی کی رضائیوں میں لیٹ جائیں گے۔

اس دن ہر سال فلسفی اپنے تاریک غاروں کو، مفکر اپنی ٹھنڈی کوٹھریوں کو

اور شاعر اپنے تصوراتی کنجوں کو چھوڑ دیتے ہیں، اور تمام کے تمام اس خاموش پہاڑ پر کھڑے ہو کر ادب کے ساتھ ایک نوجوان آدمی کی بات کو سنتے ہیں جو اپنے قاتلوں کے بارے میں کہتا ہے، ”میرے خدا! انھیں معاف کر دو، کیوں کہ انھیں معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔“

مگر جیسے ہی تاریک خاموشی روشنی کی آوازوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے، فلسفی، مفکر اور شاعر اپنی تنگ دراڑوں میں واپس چلے جاتے ہیں اور اپنی روحوں کو جھلی کاغذ کے بے معنی اوراق کے کفن میں چھپا دیتے ہیں۔

وہ خواتین جو خود کو زندگی کی شان و شوکت میں مشغول رکھتی ہیں وہ آج اپنے گدوں سے ہل جائیں گئیں تاکہ وہ غم سے چور چور ہوئی اس عورت کو دیکھیں، جو صلیب کے سامنے ایستادہ ہے، جیسے ایک غضبناک طوفان کے سامنے ایک ننھا منا نونہال؛ اور جب وہ اس عورت کے قریب پہنچیں گی تو انہیں ایک گہری آہ و زاری اور ایک دردناک قیامت سنائی دے گی۔

جدید تہذیب کے سیلاب میں رواں جوان مرد و زن آج ایک لمحے کے لئے رک جائیں گے، اور پیچھے مڑ کر نوجوان مریم مگدالنا کو، زمین و آسمان کے درمیان لٹکائے ہوئے مقدس انسان کے پیروں سے خون کے دھبوں کو، اپنے اشکوں سے دھوتے ہوئے دیکھیں گے؛ اور جب ان لوگوں کی پایاب آکھیں اس منظر سے اکتا جائیں گی تو وہ وہاں سے چلے جائیں گے اور جلد ہی ہنسنا

شروع کر دیں گے۔

اس دن ہر سال، موسم بہار کی بیداری کے ساتھ انسانیت بھی جاگ اٹھتی ہے اور اذیت میں گیر عیسیٰ مسیح کے نیچے کھڑے ہو کر روتی ہے، اس کے بعد وہ اپنی آنکھیں بند کر دیتی ہے اور خود کو گہری نیند کے حوالہ کر دیتی ہے۔ لیکن موسم بہار بیدار رہے گا، وہ مسکراتا اور آگے بڑھتا رہے گا اور سنہرے اور مہکتے طلائی لباس میں ملبوس ہو کر وہ خود کو موسم گرما میں ضم کر دے گا۔ انسانیت ایک نوحہ خواں ہے، جو زمانہ ہاکی یادوں اور ان کے ہیروؤں کا ماتم کرنے سے مسرور ہوتی ہے.... اگر انسانیت کے پاس سمجھ ہوتی، تو ان کی کامرانی پر شادماں ہوتی۔ آدمیت کسی زخمی جانور کے بغل میں مسرت سے کھڑے ایک بچے کی مانند ہے۔ آدمیت اس طاقتور سے طاقتور تر ہوتے ہوئے سیلاب کے سامنے ہنستی ہے جو درختوں کی سوکھی ٹہنیوں کو عدم میں بہا کر لے جاتی ہے اور قوت کے ساتھ چسپاں نہ کی ہوئی تمام چیزوں کو مصمم ارادے کے ساتھ بڑھالے جاتی ہے۔

آدمیت ناصرہ کے عیسیٰ کو ایک پیدائشی بیچارہ کے طور پر دیکھتی ہے، جس نے تمام کمزوروں کے ساتھ مصیبت اور بے عزتی برداشت کی۔ اور اس پر ترس کھائی جاتی ہے کیونکہ آدمیت کا گمان ہے کہ اسے درد کی شدت کے ساتھ سولی پر لٹکا دیا گیا... اور آدمیت انہیں صرف گریہ زاری، چیخ و پکار اور آہ

و فغاں ہی پیش کرتی ہے۔ مسیحا کی شخصیت میں صدیوں سے آدمیت کمزوری کی عبادت کرتی آ رہی ہے۔

عیسیٰ کمزور نہیں تھے! وہ طاقتور تھے اور طاقتور ہیں۔ لیکن لوگ طاقت کے صحیح معنی پر کان دھرنا گوارا نہیں کرتے۔

عیسیٰ نے کبھی بھی خوف کی زندگی نہیں گزاری، نہ ہی وہ دلسوز اور شکایت کرتے ہوئے رحلت کر گئے... انہوں نے ایک رہنما کی طرح اپنی زندگی بسر کی؛ وہ ایک مردِ مجاہد کی مانند صلیب پر لٹکائے گئے؛ وہ ویسی دلیری سے انتقال کو پہنچے کہ ان کے قاتل اور اذیت دینے والے خوفزدہ ہو گئے۔

عیسیٰ کوئی ٹوٹے پروں والا طائر نہیں تھے؛ وہ ایک غضبناک طوفان تھے

جس نے تمام ٹیڑھے پروں کو توڑ دیا۔ وہ نہ اپنے ایذاہندگان، نہ اپنے دشمنوں سے ڈرتے تھے۔ اپنے قاتلوں کے سامنے انہوں نے آہ و زاری نہیں کی۔ وہ آزاد، بہادر اور باہمت تھے۔ انہوں نے تمام مطلق العنان حکمرانوں اور ظالموں کی حکم عدولی کی۔ انہوں نے متعدی پھوڑوں کو دیکھا اور انہیں کاٹ ڈالا... انہوں نے برائی کو خاموش کر دیا، جھوٹ کو چکنا چور کر دیا اور دھوکہ دہی کا گلا گھونٹ دیا۔

نور کے دائرے کے دل سے عیسیٰ اس لئے نہیں آئے کہ وہ گھروں کو تباہ و برباد کر کے ان کے ملبوں پر راہبوں اور راہبات کی خانقاہیں تعمیر کریں۔

انھوں نے طاقتور اشخاص کو پادری یا راہب بننے کی تاکید نہیں کی، بلکہ وہ اس
 زمیں پر ایک نئی روح پھونکنے کی خاطر آئے، جس میں انسانی ہڈیوں اور
 کھوپڑیوں پر تعمیر کردہ کسی بھی بادشاہت کی بنیاد کو ریزہ ریزہ کرنے کی طاقت
 تھی....

وہ ان عالیشان محلوں کو ڈھانے کے لئے آئے، جن کی تعمیر کمزوروں کی
 قبروں پر ہوئی تھی، اور ان مجسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے آئے جو غریبوں
 کے جسموں پر بنائے گئے تھے۔ عیسیٰ مسیح یہاں اس لئے نہیں بھیجے گئے تھے
 کہ وہ لوگوں کی گھٹیا جھونپڑیوں اور افسردہ چھپروں کے درمیان عالیشان کلیسا
 اور عبادت گاہیں تعمیر کریں.... وہ انسانی دل کو ایک مندر، روح کو نیاز گاہ اور
 دماغ کو ایک مرشد بنانے کے لئے آئے۔

یہ تھے عیسیٰ ناصری کے مقاصد، اور یہ ہیں وہ تعلیمات جن کی خاطر انھیں
 مصلوب کر دیا گیا۔ اور اگر انسانیت عقلمند ہوتی تو وہ آج اٹھ جاتی اور باقوت
 فتح کا گیت اور کامیابی کا ترانہ گاتی۔

اے مصلوب عیسیٰ مسیحائے عالم! اے کوہِ گول گھوٹھا سے زمانہ ہا کے غمزدہ
 ہجوم کو دکھ کے ساتھ دیکھ رہے مسیحا، اے تاریک قوموں کے شور و غل کو
 سن رہے اور ابدیت کے خواب کو جاننے والے عیسیٰ!... تم صلیب پر، ایک
 ہزار سلطنتوں میں ایک ہزار تخت و تاجوں پر گدی نشین ایک ہزار شہنشاہوں

سے زیادہ جمیل اور شان و کبریائی کا نظارہ ہو!...
موت کی تکلیف میں، تم ایک ہزار جنگوں میں ایک ہزار جرنیلوں سے
زیادہ طاقتور ہو!...

اپنے غم میں، تم تمام پھولوں سے لیس بہار سے شادماں ہو!...
اپنی مصیبت کے ساتھ، تم فلک کے روتے بلکتے فرشتوں سے بالاتر خاموش
بہادری کا منظر ہو!...

تمہیں کوڑے مارنے والوں کے آگے تم چٹانی پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہو!...
تمہارا کانٹوں کا سہرا بہرام کے تاجِ شہانی سے زیادہ تاباں اور پر جلال ہے...
تمہارے ہاتھوں میں ٹھونکی گئی میخیں فرشتوں کے شہنشاہ، جو پیترا، کی
عصائے شہانی سے زیادہ خوبصورت ہیں...
تمہارے پیروں پر خون کی چھینٹیں محبت کی دیوی، اشتہار، کے گلے کے ہار
سے بھی زیادہ تابندہ ہیں۔

ان کمزور اشخاص کو معاف کر دو جو آج تم پر ماتم کر رہے ہیں، کیوں کہ
انہیں نہیں معلوم ہے کہ اپنا ماتم آپ کیسے کریں!...
انہیں معاف کر دو، کیونکہ انہیں نہیں معلوم کہ تم نے موت کے ذریعہ
موت پر فتح پائی، اور مردہ لوگوں کو زندگی بخشی...
انہیں معاف کر دو، کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں کہ تمہاری طاقت اب بھی

ان کی منتظر ہے!....

انہیں معاف کر دو، کیونکہ انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ ہر دن تمہارا ہی دن

ہے۔

جشن کی شام

رات آچکی تھی اور تاریکی نے پورے شہر کو اپنے حصار میں لے لیا، جبکہ محلوں، جھونپڑیوں اور دوکانوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ عوام الناس، اپنے تیوہاری کپڑوں میں ملبوس، گلیوں میں اٹڈے پڑے تھے، ان کے چہروں پر جشن اور اطمینان کے آثار نمایاں تھے۔

ہجوم کے شور و غل سے الگ تھلگ، میں تنہا ہی چل رہا تھا اور اس انسان کی سوچ میں محو تھا جس کی عظمت کو یہ لوگ سلام پیش کر رہے تھے، اور میں اس، زمانہ ہا کی ذہانت کے بارے میں مراقبہ میں گیا ہوا تھا، جس کی پیدائش غربت میں ہوئی تھی، جس نے پارسائی میں زندگی گزاری تھی اور جس نے صلیب پر وفات پائی تھی۔

میں اس تابناک قندیل کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے ملکِ شام کے اس بھولے بھالے گاؤں میں مقدس روح نے روشن کیا تھا... وہ مقدس روح، جو تمام زمانوں پر منڈلاتی ہے اور اپنی سچائی کے بل بوتے پر ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں گھس جاتی ہے۔

عوامی باغ میں پہنچ کر میں نے خود کو ایک سادے انداز کی کرسی پر بٹھا لیا اور بے برگ و بار درختوں کے درمیان سے بھیر بھاڑ والی گلیوں کو دیکھنے

لگا؛ میں نے حمدیہ گیت اور جشن منانے والوں کے گانوں پر اپنے کان لگا دیئے۔

ایک گھنٹہ کے مراقبے کے بعد، جب میں نے اپنی نگاہ گھمائی تو اپنے بغل میں ایک آدمی کو بیٹھا ہوا پا کر مجھے تعجب ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سے ٹہنی تھی، جس سے وہ زمین پر مبہم تصویریں بنا رہا تھا۔ میں چونک گیا، کیونکہ نہ میں نے اس کو آتے ہوئے دیکھا تھا نہ ہی اس کی آہٹ کو سنا تھا، لیکن میں نے اپنے دل میں کہا، ”وہ تنہا ہے، جیسے کہ میں ہوں۔“ اور اسے اچھی طرح سے دیکھنے کے بعد میں نے پایا کہ اپنے قدیم طرز لباس اور لمبے بالوں کے باوجود وہ ایک پر جلال اور توجہ کا مستحق شخص تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس نے میرے اندر کے خیالات کو بھانپ لیا، کیونکہ ایک گہری اور عجیب آواز میں اس نے کہا، ”شب بخیر، میرے بیٹے۔“

”آپ کو شب بخیر،“ میں نے عزت کے ساتھ جواب دیا۔

اور وہ دوبارہ تصویر بنانے میں مشغول ہو گیا، مگر اس کی عجیب سی سکون بخش آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور میں نے اس سے دوبارہ باتیں شروع کیں، ”کیا آپ اس شہر میں اجنبی ہیں؟“

”ہاں، میں اس شہر اور ہر شہر میں اجنبی ہوں،“ اس نے جواب دیا۔

میں نے اسے تسلی دی اور کہا، ”چھٹیوں کے ان دنوں میں ایک اجنبی کو

یہ بھول جانا چاہئے کہ وہ باہر سے آیا ہوا ہے، کیونکہ اس وقت لوگوں میں رحمہلی اور سخاوت ملتی ہے۔“ اس نے تھکے ہوئے انداز میں جواب دیا، ”میں ان دنوں میں اور دنوں کی بنسبت زیادہ اجنبی بن جاتا ہوں۔“ اس طرح سے بول چکنے کے بعد، اس نے صاف آسمانوں کی جانب دیکھا؛ اس کی آنکھیں نے ستاروں کا معاینہ کیا اور اس کے ہونٹ کپکانے لگے گویا کہ اس نے چرخ بریس میں واقع دور دراز کے کسی ملک کی تصویر پالی ہو۔ اس کی عجیب و غریب بات نے میری دلچسپی کو مہمیز کیا، اور میں نے کہا، ”آج کل سال کا وہ عرصہ چل رہا ہے جب لوگ دوسرے لوگوں کے تئیں رحمہل ہوتے ہیں۔ اس وقت مالدار لوگ غریبوں کو یاد کرتے ہیں اور طاقتوروں کی کمزوروں کے ساتھ درد مندی ہوتی ہے۔“

اس نے جواب دیا، ”ہاں، مالدار لوگوں کی غریبوں پر عارضی رحمہلی تلخ ہے، طاقتوروں کی کمزوروں کے تئیں ہمدردی برتری کو یاد دلانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

میں نے اس بات کی تائید کی، ”تمہاری باتوں میں وزن ہے، مگر کمزور بچارے یہ جاننے کی زحمت نہیں اٹھاتے کہ مالداروں کے دلوں میں کیا بات ہوتی ہے، اور بھوکے لوگ کبھی نہیں سوچتے کہ ان کی تمنا آمیز روٹی کس طرح سے گوندھی اور سینکی جاتی ہے۔“

اور اس نے جواب دیا، ”وصول کنندہ چوکنا نہیں ہوتا، لیکن دینے والے شخص پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ احتیاط کرے کہ اس کا یہ عمل بھائی چارے کی محبت اور دوستانہ مدد کے لئے ہو، نہ کہ خود تکریبی کے لئے۔“

میں اس کی عقلمندی پر حیران ہوا، اور میں دوبارہ اس کے قدیم حلیہ اور عجیب لباس پر غور کرنے لگا۔ پھر میں اپنی فطری ذہنیت میں واپس ہوا، اور میں نے کہا، ”ایسا لگتا ہے کہ تمہیں مدد کی ضرورت ہے؛ کیا تم مجھے سے کچھ سکھ سکتے قبول کرو گے؟“ اور ایک دکھی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے مجھے ان الفاظ میں جواب دیا، ”ہاں، مجھے سخت ضرورت ہے، لیکن سونے یا چاندی کی نہیں۔“

حیران ہو کر میں نے پوچھا، ”آخر تمہیں کس چیز کی حاجت ہے؟“

”میں پناہ کا ضرورت مند ہوں۔ مجھے ایک ایسی جگہ کی ضرورت ہے جہاں میں اپنے سر اور خیالات کو آرام دے سکوں۔“

”براہ مہربانی یہ دو دینار لے لو اور سرائے میں جا کر قیام کر لو،“ میں نے اصرار کیا۔

غمگین انداز میں اس نے جواب دیا، ”میں نے ہر سرائے میں کوشش کی، ہر دروازے پر دستک دی، لیکن بیکار میں۔ میں کھانے کی ہر دوکان میں داخل ہوا، لیکن کسی نے بھی میری مدد کرنے کی پرواہ نہیں کی۔ میں زخمی

ہوں، بھوکا نہیں؛ میں مایوس ہوں، تھکا ہوا نہیں؛ مجھے ایک چھت کی نہیں،
بلکہ ایک انسانی پناہ کی ضرورت ہے۔“

میں نے اپنے دل میں کہا، ”کتنا عجیب ہے یہ شخص! کبھی وہ ایک فلسفی
کی طرح بات کرتا ہے تو کبھی ایک پاگل کی مانند۔“ جیسے ہی میں نے اپنے
باطن کے کانوں میں ان الفاظ کے ساتھ سرگوشی کی، وہ میری جانب گھورنے
لگا، اپنی آواز کو ایک دکھی حد تک نیچا کر لیا، اور گویا ہوا، ”ہاں، میں ایک
پاگل آدمی ہوں، لیکن ایک پاگل شخص بھی کسی پناہ گاہ کے بغیر خود کو اجنبی
اور بغیر خوراک کے بھوکا محسوس کرے گا، چونکہ آدمی تہی دل ہیں۔“

میں نے اس سے یہ کہتے ہوئے معذرت کی، ”مجھے اپنے ناشائستہ خیال پر
افسوس ہے۔ کیا تم میری مہمان نوازی کو قبول کرو گے اور میرے گھر میں
قیام کرو گے؟“

”میں نے تمہارے دروازے اور تمام دروازوں پر ہزار بار دستک دی، اور
مجھے کوئی جواب نہیں ملا،“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
تب مجھے مکمل یقین ہوا کہ وہ درحقیقت پاگل ہے، اور میں نے تجویز
پیش کی، ”چلو اب چلتے ہیں، اور میرے گھر جاتے ہیں۔“

اس نے اپنا سر آہستہ سے اٹھایا، اور کہا، ”اگر تم میری شناخت سے واقف
ہوتے تو تم مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت نہ دیتے۔“

”تم کون ہو؟“ میں نے ڈرتے ہوئے، آہستہ سے پوچھا۔

بحرِ اعظم کی گرج سی لگنے والی ایک آواز میں اس نے تلخی کے ساتھ

کڑک کر کہا، ”میں ایک ایسا انقلاب ہوں جو وہ تعمیر کرتا ہے جسے قومیں مسماہ

کرتیں ہیں... میں وہ طوفان ہوں جو زمانوں کے ذریعہ لگائے گئے پودوں کو

جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے... میں وہ ہوں جو زمین پر امن نہیں بلکہ جنگ پھیلانے

کے لئے آیا ہے، کیونکہ آدمی صرف بدحالی میں ہی قانع ہوتا ہے!“

آنسو اس کے گالوں کی راہ لے رہے تھے، تو وہ کھڑا ہو کر کافی بلند ہو

گیا، اور ہالہ نور کی کہرے کی سی چادر اس کے ارد گرد جمع ہونے لگی، اور اس

نے اپنے بازو پھیلا دیئے، تو میں نے اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں میخوں

کے نشانات دیکھے؛ میں نے اس کے سامنے فوراً بے قابو ہو کر سجدہ کیا اور چلا

کر پکارا، ”اے مسیحائے عالم! اے ناصرہ کے عیسیٰ!“

اور دکھ کے عالم میں اس نے اپنی بات جاری رکھی، ”لوگ میری عزت

میں جشن منا رہے ہیں، وہ میرے نام سے منسوب کی گئی رولیتوں کی پیروی

کر رہے ہیں، لیکن جہاں تک میری اپنی ذات کی بات ہے، میں ایک اجنبی

ہوں، جو اس زمین پر مشرق سے مغرب تک گھومتا پھرتا ہے، اور مجھے کوئی

نہیں جانتا ہے۔ لومڑیوں کے اپنے اپنے بل اور آسمان میں اڑنے والے

پرندوں کے اپنے اپنے گھونسلے ہیں لیکن انسان کی اولاد کا اپنے سر کو آرام دینے

کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔“

اس لمحے میں نے اپنی آنکھیں کھولیں، اپنے سر کو اٹھایا اور چاروں طرف دیکھا، لیکن مجھے اپنے سامنے دھوئیں کی ایک مینار کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا، اور میں نے محض رات کے سکوت کی کپکپاتی آواز ہی سنی جو ابدیت کی گہرائیوں سے آرہی تھی۔ میں نے اپنا ہوش سنبھالا اور دوری پر نغمہ طراز ہجوم کو دوبارہ دیکھا، اور میرے باطن کی ایک آواز نے کہا، ”وہ طاقت جو دل کی زخم کھانے سے حفاظت کرتی ہے، وہی طاقت باطن میں دل کو اس کی مطلوبہ عظمت میں بڑھنے سے درکنار رکھتی ہے۔ با آواز نغمہ سرائی میٹھی ہوتی ہے، لیکن دل کا نغمہ آفاق کی پاکیزہ آواز ہوتی ہے۔“

گورکن

رات کے وحشت ناک سکوت میں، جب تمام آفاقی چیزیں گھسنی گھٹاؤں کے دم خفا کرنے والے پردے کے پیچھے غائب ہو گئیں، میں تنہا خوف کے عالم میں ملک الموت ہا کی وادی میں گھوم رہا تھا۔ جب آدھی رات کا سماں ہوا، اور بھیانک و ہڈی پنجروں کے پروں سے اڑنے والے بھوت میرے اوپر جھپٹ پڑے تو میں نے اپنے سامنے ایک بھاری بھر کم دیو پیکر کو کھڑے پایا، وہ مجھے اپنے تنویمی وحشت سے گردیدہ کر رہا تھا۔ ایک گرجدار آواز میں اس نے کہا، ”تمہارا خوف دگنا ہے۔ تمہیں میرے خوف میں مبتلا ہونے سے خوف لاحق ہے! تم اس کی پردہ داری نہیں کر سکتے ہو، کیونکہ تم مکڑی کے باریک جال سے بھی کمزور ہو۔ تمہارا ارضی نام کیا ہے؟“

میں نے ایک بڑی چٹان کا اپنی پیٹھ کو سہارا دیا، اپنے آپ کو اس اچانک صدمے سے سنبھالا، اور ایک بیمار سی، کپکپاتی آواز میں جواب دیا، ”میرا نام عبد اللہ، یعنی اللہ کا غلام ہے۔“ کچھ دیر تک وہ ایک دہشتناک خاموشی سے خاموش رہا۔ میں اس کے حلیہ سے مانوس ہو گیا، لیکن اس کے پر اسرار الفاظ اور خیالات، اس کے عجیب و غریب اعتقادات اور ارادوں سے میں

دوبارہ لرزہ بر اندام ہو گیا۔

اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا، ”متعدد ہیں خدا کے بندے، اور اپنے بندوں

سے خدا کی پریشانیاں کثیر ہیں۔ زمین کی وسیع آفت میں ایک اور تباہی

کا اضافہ کرنے کے بجائے تمہارے والد نے تمہارا نام بھوتوں کا آقا کیوں

نہیں رکھا؟ تم خوف کی وجہ سے اپنے آباء و اجداد سے عطا ہوئے تحفوں کے

چھوٹے سے دائرے سے چمٹے رہتے ہو، اور تمہارے رنج و الم تمہارے والدین

کے میراث کی دین ہیں، اور جب تک تم خود ایک مردہ نہیں بنتے تم موت

کے غلام رہو گے۔

”تمہارے پیشے مسرفانہ و تباہ حال اور تمہاری زندگیاں کھوکھلی ہیں۔ حقیقی

زیست کی تو تمہیں ہوا بھی نہیں لگی ہے، اور لگے گی بھی نہیں؛ نہ ہی تمہاری

فریب خوردہ ذات تمہاری زندہ موت کو کبھی سمجھ پائے گی۔ تمہاری سراب

بھری آنکھیں زندگی کے طوفان کے سامنے لوگوں کو کانپتے ہوئے دیکھتی ہیں

مگر تم ان کے زندہ جاوید ہونے کا اعتقاد رکھتے ہو، جبکہ حقیقت میں وہ اپنی

پیدائش کے وقت سے ہی مردہ تھے۔ ان کو دفن کرنے والا کوئی نہیں تھا، اور

تمہارے لیے ایک اچھا پیشہ گورکن کا ہوگا، اور اس طرح تم گھروں، راستوں

اور کلیساؤں میں انبار در انبار لاشوں سے چند زندہ افراد کو چھٹکارا دلا سکتے ہو۔

میں نے اعتراض کیا، ”میں اس طرح کا پیشہ اختیار نہیں کر سکتا ہوں۔

میرے اہل و عیال کو میری تائید اور میری مصاحبت کی ضرورت ہے۔“ وہ میری طرف جھکا تو مضبوط شاہ بلوط کے درخت کی جڑوں جیسے اس کے وہ گٹھیلے اعصاب نظر آئے جو زندگی اور طاقت سے بھر پور تھے، اور اس نے کڑک کر کہا، ”ان میں سے ہر ایک کو ایک پھاوڑا تھا کر کہو کہ قبریں کھودیں؛ تمہاری زندگی پلاسٹر کی ہوئی سفید دیواروں کے پیچھے چھپی ہوئی کالی مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ آؤ ہم سے مل جاؤ، کیونکہ صرف ہم جنات ہی حقیقت سے واقف ہیں! قبر کھودنے کا کام دھیما لیکن مثبت نفع لاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ مردہ مخلوقات غائب ہو جاتی ہیں جو آندھی سے لرزتی ہیں اور آندھی کے ساتھ کبھی گامزن نہیں ہوتیں۔“ اس نے اور کچھ سوچا اور پھر پوچھا، ”تمہارا مذہب کیا ہے؟“

میں نے بہادری سے جواب دیا، ”میں خدا میں یقین رکھتا ہوں اور اس کے نبیوں کی عزت کرتا ہوں؛ مجھے نیکی سے محبت اور ابدیت میں یقین ہے۔“ غیر معمولی دانشمندی اور پختہ یقین کے ساتھ اس نے جواب دیا، ”اس طرح کے کھوکھلے الفاظ انسان کی زبان پر علم نے نہیں بلکہ گزشتہ زمانہ ہانے چڑھا رکھے ہیں، اصل میں تمہیں صرف اپنی ذات پر یقین ہے؛ تم اپنے علاوہ کسی اور کی توقیر نہیں کرتے ہو؛ اور تمہیں صرف اپنی خواہشات کی بقائے دوام پر ایمان ہے۔ ابتدا ہی سے آدمی نے اپنی ہی ذات کی عبادت کی ہے، خود کی

ذات کو مناسب القاب عطا کئے ہیں، اور یہ سلسلہ اب تک قائم و دائم ہے۔ جب وہ منہ سے لفظِ ’خدا‘ نکالتا ہے تو اسی کی مراد وہی اپنی ذات ہوتی ہے۔“ پھر وہ جن گرجتے ہوئے ہنسا جس کی صدائے بازگشت غاروں کی فضا میں دیر تک چلتی رہی۔ اس کے بعد اس نے طعنہ دیتے ہوئے کہا، ”اپنی ذات کی عبادت کرنے والے لوگ کتنے عجیب ہیں، جبکہ ان کا حقیقی وجود اس زمین پر ایک لاش کے سوا اور کچھ نہیں ہے!“

وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا، اور میں نے اس کی باتوں کو پھر سے سوچا اور ان کے بارے میں غور و فکر کیا۔ اس کے پاس وہ علم تھا جو زندگی سے عجیب تر، موت سے زیادہ وحشت ناک، اور سچائی سے زیادہ گہرا تھا۔ ڈر ڈر کے میں نے یہ پوچھنے کی جرات کی، ”کیا تمہارا کوئی مذہب یا خدا ہے؟“ وہ بولا، ”میرا نام مجنون خدا ہے، اور میں ہمیشہ پیدا ہوا تھا اور میں خود اپنی ذات کا خدا ہوں۔ میں عقلمند نہیں ہوں، کیونکہ دانش مندی کمزوروں کی خصوصیت ہے۔ میں مضبوط ہوں، اور زمین میرے پیروں کے قدموں کے نیچے چلتی ہے؛ اور جب میں رک جاتا ہوں تو ستاروں کا جلوس بھی میرے ساتھ رک جاتا ہے۔ میں لوگوں کا مذاق اڑاتا ہوں... میں راتوں کے جناتوں کے ساتھ رہتا ہوں... میرا اٹھنا بیٹھنا جنات کے عظیم بادشاہوں کے ساتھ رہتا ہے... میں وجود اور عدم وجود کے رازوں کا مالک ہوں۔“

”صبح کے وقت میں سورج کی بے حرمتی کرتا ہوں... دوپہر کے وقت میں انسانیت کو برا بھلا کہتا ہوں، شام کے وقت میں فطرت کو غرق کرتا ہوں... اور رات میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر میں اپنی عبادت کرتا ہوں۔ میں کبھی سوتا نہیں ہوں، کیونکہ میں وقت ہوں، سمندر ہوں اور اپنا وجود آپ ہوں... کھانے کے طور پر میں انسانی جسموں کو کھاتا ہوں، اپنی پیاس بجھانے کی خاطر میں ان کا خون پیتا ہوں اور سانس لینے کے لئے ان کی اکھڑتی سانسوں کو استعمال کرتا ہوں۔ اگرچہ تم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو، تم میرے بھائی ہو، اور تم میری ہی طرح رہتے ہو۔ چلے جاؤ، اے منافق! جاؤ زمین پر سنکنے واپس جاؤ اور زندہ مردوں کے بیچ اپنی عبادت کرو۔“

میں اس پتھریلی اور غار نما وادی سے منشیاتی حیرانی کے سے عالم میں ڈمگاتے ہوئے واپس آیا، مجھے اپنے کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا! اس کے ذریعہ بتائی گئی کچھ سچائیوں کے درد سے میں چور چور ہو گیا تھا، اور اس پوری رات کو میں مرغزاروں میں، غمگین خیالوں میں محو، گھومتا پھرا۔

میں نے ایک پھاوڑا حاصل کیا اور خود سے کہا، ”قبریں گہری کھودو... اب جاؤ اور جہاں کہیں بھی تم کو کوئی زندہ مردہ ملے، اسے زمین میں دفن کر دو۔“

اسی دن سے میں قبریں کھود رہا ہوں اور زندہ مردوں کو دفن کر رہا
ہوں۔ لیکن زندہ مردے کثیر تعداد میں ہیں اور میں تنہا ہوں، میرا کوئی
مددگار نہیں ہے...

شہد ملایا زہر

شمالی لبنان کی مدہوش کرنے والی تابندگی بھری خوبصورت صبح تھی جب ٹیولہ گاؤں کے مکین اپنی رہائش گاہوں کے بیچ واقع چھوٹے سے کلیسا کے برآمدے کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ وہ سب فعارس رحل کا اچانک اور بلا اطلاع گاؤں چھوڑ کر کسی نامعلوم جگہ چلے جانے پر بحث کر رہے تھے۔ فعارس رحل اپنی دلہن، جس کے ساتھ اس نے محض آدھا سال پہلے شادی کی تھی، کو گاؤں میں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

فعارس رحل گاؤں کا شیخ اور قائد تھا اور اس کو یہ رتبہ ٹیولہ گاؤں پر صدیوں سے حکمرانی کرتے آ رہے پرکھوں سے وراثت میں ملا تھا۔ گرچہ ابھی وہ ٹھیک سے ستائیس سال کا بھی نہیں ہوا تھا، مگر اس کے اندر زبردست صلاحیت اور اخلاص تھا جس کی وجہ سے اسے تمام کسانوں کی تعریف، احترام اور عزت ملتی تھی۔ جب فعارس رحل نے سوسن سے شادی کی تھی تو لوگوں نے اس کے حوالے سے یہ تبصرہ کیا تھا، ”فعارس رحل کتنا خوش نصیب ہے! اسے جوانی ہی میں حیات کی خوشیوں کے ذخیرے سے وہ سب فیض حاصل ہوا ہے جن کی کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے، اور وہ تو ابھی ایک نوجوان ہی ہے!

”

اس صبح، جب سارے ٹیولہ کے مکین نیند سے اٹھے اور انہیں پتہ چلا کہ شیخ اپنے گھوڑے پر سارا سونا لاد کر، کسی کو الوداع کہے بغیر ہی گاؤں سے روانہ ہو گیا، تو تجسس اور اضطراب کا سماں طاری ہوا، اور پھر کئی ایک سوال شروع ہو گئے کہ شیخ کو اپنی بیوی اور اپنا گھر، اپنی زمین اور اپنے انگور کے باغ چھوڑ کر چلے جانے پر آخر کس چیز نے مجبور کیا؟

روایت اور جغرافیہ کی وجہ سے شمالی لبنان میں زندگی انتہائی معاشرتی ہے، اور لوگ اپنی خوشیاں اور غم آپس میں بانٹتے ہیں، جس کے پس پردہ ان کا بے تکبر جذبہ اور جبلی قبیلہ انگیزی ہے۔ کوئی بھی واقعہ ہو، تو گاؤں کے سارے باشندے اس کی بابت جاننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں، حتیٰ الوسع اپنا اپنا تعاون پیش کرتے ہیں اور پھر سے کام کاج میں لگ جاتے ہیں، جب تک کہ تقدیر دوبارہ جمع ہونے کا کوئی امر فراہم نہ کرے۔

اس دن، یہ ایک ایسا معاملہ تھا کہ جس نے ٹیولہ کے لوگوں کو اپنے کاموں سے دور کر کے مار ٹیولہ کے چرچ کے پاس جمع کر دیا، جہاں پر وہ اپنے شیخ کی روانگی پر بحث اور اس معاملہ کے انوکھے پن کی بابت تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔

اسی وقت مقامی چرچ کے سربراہ، فادر اسٹیفن، آئے، اور ان کے اترے ہوئے چہرے پر کوئی بھی گہری تکلیف کی واضح علامات پڑھ سکتا تھا، جو علامات

دردناک طور پر زخمی روح کی عکاس تھیں۔ ایک لمحے کے لئے منظر پر غور و فکر کرنے کے بعد انھوں نے کہا، ”مت پوچھو... مجھ سے کوئی سوال مت پوچھو! آج سحر ہونے سے قبل ہی، شیخ فعارس نے میرے گھر کے دروازے پر دستک دی، اور میں نے اسے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے دیکھا، اور اس کے چہرے پر گہرا دکھ اور تکلیف دہ الم عیاں تھے۔ جب میں نے اس کی آمد کے حوالے سے وقت کے عجیب ہونے کا ذکر کیا تو اس نے جواب دیا، ’فادر، میں آپ سے الوداع کہنے آیا ہوں، کیونکہ میں سمندر پار سفر پر جا رہا ہوں اور اس سر زمین میں کبھی واپس نہیں آؤں گا،‘ اور اس نے مجھے ایک مہر بند لفافہ تھما دیا جو اس کے عزیز ترین دوست نیچ ملک کے نام ہے، اور مجھ سے کہا کہ میں اسے نیچ کو پہنچا دوں۔ اس کے بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور مشرق کی جانب سرپٹ چلا گیا، اور مجھے اس نے اپنی غیر معمولی روانگی کے مقصد کو سمجھنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔“

ایک گاؤں والے نے کہا، ”بلا شبہ مراسلہ ہمیں بتا دے گا کہ ان کے جانے کا راز کیا ہے، کیونکہ نیچ ان کا قریب ترین دوست ہے۔“ ایک دوسرے شخص نے کہا، ”فادر، کیا آپ نے اس کی دلہن کو دیکھا ہے؟“ پادری نے یہ کہتے ہوئے جواب دیا، ”میں دعائے صبح کے بعد اس کی بیوی کے پاس گیا اور اسے میں نے کھڑکی پر کھڑے ہو کر نابینا سی آنکھوں سے کسی

غیر مرئی چیز کو نکلنے ہوئے پایا، وہ کسی ہوش و حواس گم ہوئے شخص جیسی لگ رہی تھی، اور جب میں نے فعارس کے متعلق دریافت کرنے کی کوشش کی تو اس نے صرف اتنا کہا، 'میں نہیں جانتی ہوں، میں نہیں جانتی ہوں!' پھر وہ اچانک اس بچے کی طرح رونے لگی جو اچانک یتیم ہو جاتا ہے۔“

جیسے ہی فادر نے اپنی بات پوری کی، لوگ گاؤں کے مشرقی حصے سے آنے والی ایک فائرنگ کی سنسنی خیز آواز سے انتہائی خوفزدہ ہو گئے، اور اس کے فوراً بعد ایک عورت کی تلخ چیخ و پکار سنائی دی۔ پھر ایک لمحے کے لئے لوگوں پر بے حرکتی کا بے حس سکتہ طاری ہوا، اور تب مرد، عورتیں اور بچے، تمام کے تمام جائے واردات کی جانب دوڑے، اور ان کے رخسار خوف اور بدشگونئی کی تاریک صورتوں میں ڈھل گئے۔ جیسے ہی وہ شیخ کی رہائش گاہ کے اردگرد واقع باغیچے میں پہنچے، تو وہ موت کی پیش کردہ ایک دل دہلا دینے والی تمثیل کے شاہد ہوئے۔ نیچ ملک زمین پر پڑا ہوا تھا، اس کے سینے سے خون کا نالہ بہہ رہا تھا اور اس کے بغل میں سوسن، شیخ فعارس رحل کی بیوی، کھڑی ہو کر اپنے بالوں کو نوچ رہی تھی، اپنے کپڑے پھاڑ رہی تھی، اپنے بازوؤں کو زور زور سے ہوا میں پیٹ رہی تھی، اور وحشت سے چیخ رہی تھی، ”نیچ... نیچ... تم نے ایسا کیوں کیا!“

دیکھنے والے ششدر تھے، اور ایسا لگ رہا تھا گویا کہ موت کے غیر مرئی

ہاتھوں نے ان کے دلوں کو اپنی برقی انگلیوں سے پکڑ لیا ہے۔ پادری نے مردہ نمبج کے داہنے ہاتھ میں وہ خط پایا جسے اس نے اس کو اسی صبح دیا تھا، اور اس نے خط کو اس صفائی سے اپنے چونے میں ڈال لیا کہ تشویش کے عالم میں مبتلا بھیر میں سے کسی کی بھی نظر اس پر نہیں پڑی۔

نمبج کو اس کی دکھاری ماں کے پاس لے جایا گیا جو اپنے اکلوتے بیٹے کے بے جان بدن کو دیکھ کر صدمہ کی وجہ سے پاگل ہو گئی اور جلدی ہی اس سے ابدیت میں جا ملی۔ سون کو دھیرے دھیرے اس کے گھر میں لے جایا گیا، وہ پھسلتی زندگی اور موت کی پکڑ کے مابین لرزاں تھی۔

جب فادر اسٹیفن اپنے ناتواں کندھوں کے ساتھ اپنے گھر پہنچے، انھوں نے دروازے کو بند کر لیا، اپنا پڑھنے والا عینک لگایا اور ایک کپکپاتی پھسپھساہٹ میں وہ پیغام خود کو پڑھ کر سنانے لگے جو انھوں نے انتقال کر چکے نمبج کے ہاتھوں سے لیا تھا۔

"میرے عزیز ترین دوست نمبج،

"مجھے اپنے آباء و اجداد کی اس سر زمین کو چھوڑ کر جانا چاہیے، کیونکہ یہاں پر میری مسلسل موجودگی تمہیں، میری بیوی کو اور خود میری ذات کو مصیبت میں مبتلا کر رہی ہے۔ تم روح سے نیک ہو، اور دوست یا پڑوسی سے دغا بازی کو برا سمجھتے ہو، اور گرچہ مجھے معلوم ہے کہ سون معصوم اور پاکباز

ہے، مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ وہ سچی محبت جو تمہارے اور سوسن کے دلوں کو جوڑے ہوئے ہے، وہ تمہاری طاقت سے باہر اور میری امیدوں کے حصار سے پرے ہے۔ میں خدا کے اس طاقتور ارادے کے خلاف اب مزید جدوجہد نہیں کر سکتا ہوں، جیسے میں عظیم کدیشہ دریا کے زبردست بہاؤ کو روک نہیں سکتا ہوں۔

"بیچ، تم تب سے میرے مخلص دوست رہے ہو، جب سے ہم بچپن میں میدانوں میں کھیلا کرتے تھے۔ اور خدا کے سامنے، میرا یقین کرو، تم ہمیشہ میرے دوست بنے رہو گے، میں تم سے منت سماجت کرتا ہوں کہ تم میرے بارے میں، جس طرح سے ماضی میں اچھے خیالات رکھتے تھے، اسی طرح سے اب بھی میرے بارے میں اچھا ہی سوچتے رہو۔ سوسن سے بتا دینا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں، اور میں نے اس سے تہی دل سے شادی کر کے اس کے ساتھ برا کیا۔ اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ رات کی خاموشی میں جب بھی میں نے اپنی بے چین نیند میں کروٹ بدلی اور اسے عیسیٰ مسیح کے مزار کے سامنے جھک کر دکھ کے عالم میں روتے اور چھاتی چھالتے دیکھتا تو میرا دل ہر بار دردِ سوزاں سے خون کے آنسو بہاتا تھا۔

"اس عورت کی سزا کے مقابلہ میں کوئی بھی سزا سخت تر نہیں ہو سکتی، جو عورت خود کو دو ایسے آدمیوں کے درمیان مقید پاتی ہے، جن میں سے ایک

سے وہ محبت کرتی ہو، جبکہ دوسرا اس سے محبت کرتا ہو۔ سون ایک مسلسل اور دردناک دکھ سے دوچار تھی لیکن اس نے غمناک اور باعزت طریقے سے اور خاموشی سے ایک بیوی کی حیثیت میں اپنا فریضہ انجام دیا۔ اس نے کوشش کی، لیکن تمہارے لئے اپنی بے لوث محبت کا گلا نہیں گھوٹ سکی۔

"میں یہاں سے بہت دور جا رہا ہوں اور پھر کبھی دوبارہ لوٹ کر نہیں آؤں گا، کیونکہ میں اب مزید ایک سچی اور ابدی محبت کے درمیان حائل نہیں ہو سکتا، جس محبت کو خدا کے بازوؤں کا سہارا ہو۔ خدا اپنی پر اسرار حکمت میں، تم دونوں کو سلامت اور خوش و خرم رکھے!

"فعارس"

فادر اسٹیفن نے خط کو موڑ کر دوبارہ اپنی جیب میں ڈال لیا، اور دور وادی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ تفکر و تدبر کے عظیم سمندر میں دور تک اور گہرائی میں تیرنے لگے، اور دانشمندانہ اور شدید غور و فکر کے بعد، وہ اچانک کھڑے ہوئے، گویا کہ انھوں نے اپنے الجھے ہوئے خیالات کے گوندھے ہوئے موڑوں کے درمیان ایک نرم و نازک اور دہشتناک راز پا لیا ہو، جو راز شیطانی مکاری سے چھپایا گیا ہو، اور جو سوچی سمجھی عیاری سے لپٹا ہوا ہو! انھوں نے چلا کر کہا، "فعارس تم کتنے زیرک ہو! تمہارا جرم کتنا بڑا، پھر بھی کتنا سادہ ہے! تم نے اس کے پاس مہلک زہر ملا ہوا شہد بھیجا،

اور ایک خط میں موت کو بند کر دیا! اور جب نیچ نے اپنے دل پر ہتھیار سے نشانہ سادھا تو جس انگلی نے گولی چلائی وہ انگلی تمہاری تھی؛ اور یہ خواہش تمہاری تھی جس نے اس کی مرضی کو گھیر لیا... فعارس، تم کتنے چالاک ہو!

”

وہ کانپتے ہوئے اپنی کرسی پر واپس آئے، وہ اپنے سر کو ہلا رہے تھے اور اپنی داڑھی اپنی انگلیوں سے کھریر رہے تھے، تب ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی جس کا مطلب خود حادثہ سے بھی زیادہ دہشتناک تھا۔ انھوں نے اپنی دعاء کی کتاب کھولی اور پڑھنے اور غور و فکر کرنے لگے۔ اور وقفے وقفے سے وہ لبنان کے متبرک دیودار درختوں کے قریب واقع ٹیولہ گاؤں کے قلب سے آ رہی عورتوں کی پیچ و پکار کو سننے کے لئے اپنے سر کو اٹھا لیتے تھے۔



سدھارتھنگر، اتر پردیش میں رہائش پذیر عبدالمحمید پوسٹ ایکٹ آزاد پیشہ مترجم، مصنف اور معلم ہیں۔ وہ اردو، عربی اور انگریزی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ بھارت کی دو معروف اسلامی دانش گاہوں جامعۃ الفلاح اور دارالعلوم دہلہ سے عالمیت و فضیلت کی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ انھوں نے مرکز المعارف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سینٹر ممبئی سے انگریزی زبان و ادب میں ڈپلومہ اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے پاس دارالعلوم دہلہ سے عربی ادب میں تخصص کی ڈگری بھی ہے۔ انھوں نے انگریزی نیوز

پورٹل TwoCircles.net کے لئے رپورٹرز اور بنگلور سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ Media Scan کے لئے معاون مدد کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ فی الحال وہ صفا شریعت کالج، سدھارتھنگر، اتر پردیش میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ ممبئی سے لکھے والے انگریزی ماہنامہ Eastern Crescent کے لئے مستقل کالم اور اردو روزناموں میں مسامین بھی لکھتے ہیں۔ ترجمہ نگاری کے میدان میں انھوں نے شمس علی، ادبی، طبی، قانونی، تفسیری اور تکنیکی پروجیکٹوں پر کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ، لنٹورینگٹ گلوبل انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی فاؤنڈیشن، کاشمیر، نیپال کے توسط سے مشورہ ادیب علیل جبران کی فکر انگریز تحریروں کو انھوں نے اردو زبان میں منتقل کیا۔



جون ۱۹۸۹ میں کشمیر سے ہجرت کرنے کے بعد، ۱۹۹۱ عیسوی سے کاشمیر و نیپال میں مکین، ذہن نشین، ۱۹۹۹ عیسوی سے انقلابی جدوجہد، علم نوح انسان، عمرانیات، ادب، سائنس، تاریخ اور فلسفہ میں دلچسپی سے مشغول رہے ہیں۔ کئی سالوں تک استاد کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ۲۰۰۶ عیسوی سے وہ لنٹورینگٹ گلوبل انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی فاؤنڈیشن، کاشمیر، نیپال میں بہ حیثیت نیم لیڈر و مدیر کام کر رہے ہیں۔ وہ

“Kashmir and Kilkenny Cats”, “Liberating the Future from the Past”, “Tenzin Tseten, the Trail and the Trait of the Time”, “The Most Perfect Man”, “I’m MiniKashmir”, “Fourteen Days that Mattered Not in the World”, “Contradictions in Special Relativity Theory”...

کے مصنف بھی ہیں۔

ISBN: 978-99946-898-5-9
Typesetter; DTP and Publisher:
Everyyoung Global Intellectual Foundation
Contribution: NRs: 800/= or USD 8.00